

# الرسالہ

سرپرست  
مولانا وحید الدین خان

سچا آغاز ہمیشہ سچے انجام پر ختم ہوتا ہے  
اور جھوٹا آغاز ہمیشہ جھوٹے انجام پر

جنوری ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ - تین روپے □ شماره ۷۴

اسلامی مرکز کا ترجمان

جنوری ۱۹۸۳  
شمارہ ۷۴

# الرسالہ

---

جمعیت بلڈنگز قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

---

مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز نے نومبر ۱۹۸۲ میں حیدرآباد کا سفر کیا۔ اس سفر کی تفصیل روداد الرسائلہ کے آئندہ کسی شمارہ میں آئے گی۔

اس دورہ میں مولانا موصوف کی متعدد تقریریں ہوئیں۔ مولانا نے اہل حیدرآباد کے سامنے اسلامی مرکز کے مشن اور اس کے طریق عمل کی بھی وضاحت کی۔ تمام تقریریں بہت دل چسپی سے سنی گئیں۔ تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں اجتماعات میں شریک ہوتے رہے۔

اس کے بعد لوگوں کے اصرار کے مطابق حیدرآباد میں اسلامی مرکز کی مقامی شاخ قائم کر دی گئی۔ اس شاخ کا دفتر مندرجہ ذیل پتہ پر قائم ہے۔ مقامی لوگ اسلامی مرکز کے لئے یا اس کی مطبوعات حاصل کرنے کے لئے یہاں سے ربط فرمائیں۔

اسلامی مرکز - بیت المدینہ - سلطان پورہ - حیدرآباد ۲۴

فون نمبر 51793

---

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ڈالر امریکی

---

## دو قسم کی روہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۹۱ میں ارشاد ہوا ہے: **قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهُ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهُ** (وہ شخص کامیاب رہا جس نے اپنے آپ کو پاک کیا اور وہ شخص برباد ہو گیا جس نے اپنے آپ کو گنداکیا) موجودہ زندگی آخرت سے پہلے کا ایک امتحانی موقع ہے۔ جو شخص یہاں سے نیک اور ستھری روح لے کر آخرت کی دنیا میں پہنچے گا وہ وہاں جنت کی پرست فضاؤں میں بسایا جائے گا اور جو شخص یہاں سے برائیوں میں لپٹی ہوئی روح لے کر آخرت کی دنیا میں جائے گا اس کو وہاں جہنم کے پُر عذاب ماحول میں دھکیل دیا جائے گا۔

موجودہ دنیا گویا خدا کی نرسری ہے۔ نرسری میں مختلف قسم کے پودے اگائے جاتے ہیں۔ زمین میں روئیدگی کی قوت بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ یہاں طرح طرح کے پودے اگ آتے ہیں۔ مالی ان سب کی جانچ کرتا ہے۔ جو پودے غیر مطلوب پودے ہیں ان کو وہ کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ اور جو پودے اس کے مطلوب پودے ہیں ان کو اہتمام سے نکال کر لے جایا جاتا ہے تاکہ کسی باغ میں ان کو پھیلنے پھولنے کے لئے نصب کر دیا جائے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے بیک وقت دونوں مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ وہ چاہے تو اپنی روح کو پاک کرے اور چاہے تو گنداکرے۔ کوئی وہ شخص ہے جو اللہ کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیتا ہے۔ اس کے سامنے جب کوئی حق آتا ہے تو وہ بے جھجک اس کا اعتراف کر لیتا ہے۔ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ خیر خواہی اور انصاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ دوستی ہو یا دشمنی ہر حال میں وہ خدا کی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ اپنے نفس کی مرضی پر۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی روح کو پاک کیا۔ اس کو اس کا خدا جنت کی پُر بہار دنیا میں بسائے گا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جو خود اپنی بڑائی میں گم رہتا ہے۔ اس کے سامنے حق آتا ہے تو وہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ معاملات میں وہ سرکشی اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ خدا کی مرضی پر۔ یہی وہ آدمی ہے جس نے اپنی روح کو گنداکیا۔ کائنات کا مالک اس کو اپنے پڑوس کے لئے قبول نہیں کرے گا۔ وہ اس کو جہنم میں دھکیل دے گا تاکہ وہ ابدی طور پر اپنے جرم کی سزا بھگتتا رہے۔

## ہم کہاں ہیں

لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داؤد و عیسی ابن مریم ذلک بما عصوا و کانوا یعتدون۔ کانوا لا یتناہون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون (المائدہ ۷۹-۷۸)

بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر گئے تھے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو برے کام سے روکتے نہ تھے جو وہ کر رہے تھے۔ کیسی بری روش تھی جو انہوں نے اختیار کی۔

یہودی حیثیت قدیم زمانہ میں وہی تھی جو آج مسلمانوں کی ہے۔ اس اعتبار سے یہ آیت مسلم معاشرہ کے بارے میں خدا کے قانون کو تیار ہی ہے۔ اس کے مطابق مسلم معاشرہ کا حد سے گزرنا یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو ستائیں اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں۔ ایسے وقت میں خدا کی طرف سے یہ فرض ہو جاتا ہے کہ جو شخص یہ دیکھے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہا ہے وہ فوراً اس کو روکنے کے لئے متحرک ہو جائے۔ کسی معاشرہ کے افراد میں اگر یہ روح ختم ہو جائے تو وہ مسلم معاشرہ خدا کی نظر میں ملعون ہے۔ اس پر خدا کی لعنت نازل ہوگی نہ کہ خدا کی رحمت۔

موجودہ مسلم معاشرہ کو دیکھئے تو آج اس کی حالت یہی ہو رہی ہے۔ ہرستی اور ہر محکمہ میں ہر روز ایسے واقعات ہو رہے ہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ستا رہا ہے جس شخص کے پاس بھی کوئی پیسہ یا کوئی زور آگیا ہے اس کا دماغ گھمنڈ کا کارخانہ بنا ہوا ہے۔ کسی مسلمان بھائی سے اگر اس کو معمولی شکایت بھی پہنچ جائے تو اس کو اس وقت تک تسکین نہیں ہوتی جب تک وہ اس مسلمان کو ذلیل نہ کرے۔ وہ اس کی بربادی کے لئے وہ سب کچھ کر داتا ہے جو اس کے بس میں ہے۔

مسلم معاشرہ میں آج ہر جگہ اور ہر وقت یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر کوئی کسی کو روکنے والا نہیں۔ کوئی کسی کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ البتہ ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی فوج کی فوج تیار ہو گئی ہے جو مسلمانوں کی مظلومیت پر تقریریں کرنے اور مضامین لکھنے کو اپنا قیادت پیشہ بنائے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کی قومی مصیبت پر لفظی بیان دینے میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ مگر مسلمانوں کی انفرادی مصیبت کے لئے کوئی نہیں دوڑتا۔ دوسرے کی یزیدیت کا اعلان ہر ایک کر رہا ہے مگر اپنی یزیدیت کی خبر کسی کو نہیں۔ آدمی کے الفاظ کو سننے والا سب سے پہلے خدا ہوتا ہے، پھر یہ لوگ اپنے بھوٹے الفاظ آخر کس کو سنارہے ہیں۔

## جوابی مذہبیت

مئی ۱۹۲۲ کا واقعہ ہے۔ لاہور کے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ہندوؤں نے ایک مندر تعمیر کیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کے اندر یہ جذبہ جاگ اٹھا کہ مندر کے ساتھ مسجد بھی ہونا چاہئے۔ جس فضا میں مندر کے کلس چمک رہے ہیں وہاں مسجد کے مینار کی عظمت بھی دکھائی دینا ضروری ہے۔ چنانچہ فوراً چندہ ہوا اور مندر کے پاس ایک زمین مسجد کے لئے حاصل کی گئی۔ نماز عشاء کے بعد اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ ساری رات کام ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ مندر کے مقابلہ میں ایک مسجد بنی ہوئی کھڑی ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس سے مناشر ہو کر ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنا یہ مشہور شعر کہا تھا:

مسجد تو بنائی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے

من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمساز ی بن نہ سکا

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بیشتر سرگرمیوں پر چسپاں ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہماری اکثر دینی سرگرمیاں حقیقتہً جوابی سرگرمیاں ہیں۔ ان کا اصل محرک کسی غیر قوم کا کوئی عمل ہے نہ کہ حقیقتہً خدا و رسول کا حکم۔

اس قسم کی مذہبیت جوابی مذہبیت ہے۔ وہ قومی محرک کے تحت پیدا ہوتی ہے نہ کہ خدائی محرک کے تحت۔ چنانچہ مسلمانوں نے مادی اور جنسرافی اور سیاسی اسباب کے تحت دیگر اقوام کو اپنا حریف سمجھ لیا ہے۔ وہ ان کو نیچا دکھا کر اپنے لئے قومی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ اسی تمام کارروائیاں بلاشبہ قومی کارروائیاں ہیں، خواہ بظاہر ان کو مذہب کے لباس میں کیوں نہ پیش کیا گیا ہو۔

مومن وہ ہے جو خدا سے ڈرے۔ جس کی تمام سرگرمیاں خدا کے زیر اثر انجام پاتی ہوں۔ اس کا رکنا خدا کے لئے ہوتا ہو اور ٹھہرنا خدا کے لئے۔ جو کام اس طرح کے جذبات کے ساتھ کیا جائے اس کے ساتھ خدا کی مدد شامل رہتی ہے۔ وہ مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ مگر جو کام دوسری قوموں کی ضد میں کیا جائے اس سے صرف نفرت اور کش مکش بڑھے گی۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ صورت حال مزید پیچیدہ ہوتی چلی جائے اور کبھی وہ حسن خاتمہ تک نہ پہنچے۔

# ڈر کی طاقت

حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانہ میں ایک شخص تھا جس کا نام صبیغ تھا۔ وہ عراق میں گھوم گھوم کر سورہ ذاریات کے بارے میں تقریریں کرتا اور اس سورہ کے مضامین میں عجیب عجیب قسم کے سوالات پیدا کر کے مسلمانوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کرتا۔

اس آدمی کو لوگوں نے سمجھایا، مگر وہ نہ مانا اس نے اپنی تقریریں جاری رکھیں۔ آخر کار عراق کے حاکم نے اس کو گرفتار کیا اور اپنے ایک قاصد کے ذریعہ اس کو خلیفہ ثانی کی خدمت میں مدینہ بھیج دیا اور لکھا کہ یہ شخص قرآن کی سورہ ذاریات کے بارے میں عجیب و غریب باتیں نکال کر مسلمانوں کو شک و شبہ میں مبتلا کرتا ہے اور ان کے عقائد کو بگاڑ رہا ہے۔

حضرت عمر نے خط کو پڑھا۔ اس کے بعد مجرم سے باتیں کیں۔ اس کو سمجھایا۔ مگر وہ شخص نہ مانا اور اپنی باتوں کو دہراتا رہا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے درہ منگوایا اور اس کو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ یہ نوبت آئی کہ وہ شخص خون میں نہا اٹھا اور مار اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ اب اس نے سپردال دی۔ اور چلا کر کہا:

قد ذهب الذی کنت اجدہ فی رأسی وہ چیز چلی گئی جس کو میں اپنے سر میں پارہا تھا  
(الاصابہ لابن حجر)

اس کے بعد حضرت عمر نے اس کو چھوڑ دیا۔ اپنی بقیہ عمر اس نے اس طرح گزاری کہ مذکورہ قسم کی باتیں دوبارہ اس سے نہیں سنی گئیں۔ دلیل کی زبان اس کے لئے بے اثر ثابت ہوئی تھی، مگر کوڑے کی زبان اس کے لئے اتنی موثر ثابت ہوئی کہ وہ ہمیشہ کے لئے اصلاح یافتہ ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سی خرابیاں صرف بے خوفی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر آدمی کو سزا کا ڈر ہو تو وہ خود بخود درست ہو جائے۔ ڈر آدمی کو سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ اور جو شخص کسی معاملہ میں سنجیدہ ہو وہ کبھی بے معنی کلام اپنی زبان سے نہیں نکالے گا، وہ الٹی حرکتیں نہیں کرے گا۔ ڈر بظاہر ایک چیز ہے۔ مگر وہ آدمی کی تمام خرابیوں کی اصلاح کر دیتا ہے۔

## بے معنی مسائل

حدیث میں آیا ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الاغلو طات۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغلو طات سے منع کیا ہے۔ اغلو طات سے مراد وہ مسائل ہیں جو واقع ہونے سے پہلے فرضی طور پر قائم کئے جاتے ہیں (ہی المسائل التي لم تقع)

دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

ان الله کرہکم قیل وقال وکثر کا السؤال اللہ نے تمہارے لئے قیل وقال کو اور کثرت سوال واضاعة المال کو اور مال ضائع کرنے کو ناپسند کیا ہے۔

یہ تعلیم بے حد حکمت پر مبنی ہے۔ اگر لوگوں کے اندر یہ مزاج باقی نہ رہے تو وہ ہر بات کو بحث کا موضوع بنائیں گے، ہر چیز کو منطق کے پیمانہ سے ناپیں گے۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوگا کہ دین کا اصل سرا جھوٹ جائے گا اور بے معنی مسائل پر لفظی بحث کے سوا ان کے پاس اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ خدا کا سادہ دین انسانی اضافوں کے بعد مشکل اور پیچیدہ دین ہو کر رہ جائے گا۔

ایک مثال لیجئے۔

ایک مرتبہ کسی نے ایک آدمی سے پوچھا کیا تم مسلمان ہو۔ اس کی زبان سے نکلا: انا مومن انشاء اللہ (خدا نے چاہا تو میں مومن ہوں) یہ بات بحث کی نہ تھی۔ مگر ماہرین فقہ نے غیر ضروری طور پر اس کو بحث کا موضوع بنایا۔ اب ان کے درمیان یہ بحث چل پڑی کہ اس قسم کا جواب دینا جائز ہے یا ناجائز۔ ایک گروہ نے کہا کہ جائز ہے۔ کیونکہ کسی کا مومن ہونا یا نہ ہونا خدا کی مشیت ہی پر ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ ناجائز ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے ایمان میں شک ہے۔

شافعی مسلک کے لوگ اس کے قائل تھے کہ انا مومن انشاء اللہ کہنا جائز ہے۔ اس کے برعکس حنفی مسلک کے لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسا کہنا جائز نہیں۔ جب یہ بحث بڑھی تو یہ سوال پیدا ہو گیا کہ ایسے لوگوں کے درمیان نکاح درست ہوگا یا نہیں۔ ایک گروہ نے کہا کہ حنفی عورت کا نکاح شافعی مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ کیونکہ اس کو اس کے ایمان پر شک ہے (لا یصح لانھا تشک فی ایمانھا) دوسروں کا فتویٰ یہ تھا ذمی عورت پر قیاس کرتے ہوئے نکاح درست ہوگا (یصح قیاسا علی الذمیة)

اس سے اندازہ کیجئے کہ غیر ضروری بحثوں میں پڑنے کے بعد صراطِ مستقیم کا سرا کس طرح چھوٹ جاتا ہے۔

# آزمائش

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوڑ دے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ حالاں کہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ پس ضرور رہے کہ اللہ یہ جان لے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون (عنکبوت ۳) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: کیا تم لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ تم کو جنت کا داخلہ مل جائے گا۔ حالاں کہ ابھی تم پر وہ حالات گزرے ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکے ہیں۔ ان پر سختیاں گزریں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ سن لو کہ اللہ کی مدد قریب ہے (بقرہ ۲۱۳)

اسی طرح ارشاد ہوا ہے کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم چھوڑ دے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے جانا ہی نہیں کہ تم میں کون لوگ ہیں جنہوں نے جہاد کیا اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے (توبہ ۱۶) اسی طرح ارشاد ہوا ہے: کیا تم نے سمجھا ہے کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ جانا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ہیں جنہوں نے جہاد کیا اور کون ہیں جو صبر کرنے والے ہیں (آل عمران ۱۴۲)

یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

استد النامس بلار الانبیاء ثم الصالحون  
ثم الامثل فالامثل۔ یبتلی الرجل علی  
حسب دینہ فان کان فی دینہ صلابۃ  
زیدلہ فی البلاء (تفسیر ابن کثیر)

سب سے زیادہ سخت آزمائش پیغمبروں کی ہے۔ ان کے بعد صالحین کی، پھر درجہ بدرجہ ان سے مشابہت رکھنے والوں کی۔ آدمی کا امتحان اس کے دین کے مطابق ہوتا ہے۔ پس اگر اس کے دین میں مضبوطی ہو تو اس کی آزمائش میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کی جنت یا اس کی ترقی درجات کا فیصلہ معمول کی دین داری پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان خاص لمحات میں ہوتا ہے جب کہ اس کا رب اس کے دین کا امتحان لے رہا ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی ٹھیک اسی مقام پر ناکام ہو جاتا ہے جہاں اس کو کامیابی کا ثبوت دینا چاہیے۔

## بے کاری

کان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ یقول: اری الرجل یعجبنی فاذا قیل لا صناعة له سقط من عینی (الترا تیب الادار یہ للکتابی، ج ۳ صفحہ ۲۳)

حضرت عمر فرماتے تھے کہ میں کسی آدمی کو دیکھتا ہوں اور وہ مجھے پسند آتا ہے۔ مگر جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی کام نہیں کرتا تو وہ میری نگاہوں سے گر جاتا ہے۔

یہی روایت ابن الجوزی نے تلبیس ابلیس میں ان الفاظ میں نقل کی ہے:

عن محمد بن عاصم قال: بلغنی ان عمدا بن الخطاب کان اذا رآی غلاما فاعجبه سأل هل له حرفة - فان قیل لا، سقط من عینه

محمد بن عاصم کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر جب کسی نوجوان کو دیکھتے اور وہ انھیں اچھا معلوم ہوتا تو پوچھتے کیا اس کا کوئی کام ہے۔ اگر کہا جاتا کہ نہیں تو وہ ان کی نگاہ سے گر جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ بے کاری نہایت بری چیز ہے۔ وہ آدمی کی تمام بہترین صلاحیتوں کو کھا جاتی ہے۔ بے کار آدمی بظاہر دیکھنے میں زندہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقتہً وہ ایک مرا ہوا انسان ہوتا ہے۔ اس کے اندر سے وہ تمام لطیف احساسات ختم ہو جاتے ہیں جو کسی انسان کو حقیقی معنوں میں انسان بناتے ہیں۔

بے کاری کی ایک صورت وہ ہے جب کہ آدمی محنت اور مشقت کی چیزوں سے گھبراتا ہے اور اس کے اندر یہ صلاحیت موجود نہیں ہوتی کہ کوئی بے مشقت کام اسے مل جائے۔ چنانچہ وہ اپنے پسندیدہ کام کے انتظار میں بے کار پڑا رہتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی کو دراشت میں یا اور کسی اتفاقی سبب سے ایسے ذرائع معاش حاصل ہو جائیں جن کے لئے اس نے کوئی ذاتی کسب نہیں کیا تھا۔ مثلاً بینک میں جمع شدہ رقم۔ یا جائیداد جس کی آمدنی یا کرایہ اس کو اپنے آپ ہر ماہ ملتا رہے۔ اس قسم کی ہر صورت بے کاری کی صورت ہے اور وہ آدمی کے لئے قاتل ہے، خواہ بظاہر وہ خوش پوش ہو اور چلتا پھرتا نظر آتا ہو۔

ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے کوئی جائز کام اختیار کرے اور صبح شام اپنے آپ کو اس میں مشغول رکھے۔ جس کے پاس کام کی مشغولیت نہیں اس کے پاس زندگی بھی نہیں۔ بے کار آدمی کو کبھی بھی آپ اصلی انسان نہیں پائیں گے۔

# جرم کی نفسیات

لینن (Lennon) اور چپ مین Chapman امریکہ کے دو بیٹل سنگر (Beatle Singer) تھے۔ لینن کو نسبتاً زیادہ کامیابی ہوئی۔ وہ کافی مشہور ہو گیا۔ یہ بات چپ مین کو برداشت نہ ہو سکی۔ اس کے دل میں لینن کے خلاف حسد کا جذبہ جاگ اٹھا۔ یہ جذبہ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک روز موقع پا کر لینن کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

اخباری رپورٹ کے مطابق اس قتل کا سبب پیشہ ورانہ رقابت (Professional Rivalry) تھی۔ اس کے بعد چپ مین کے خلاف مقدمہ چلا۔ قاتل نے اس سلسلے میں عدالت میں اپنا جواب بیان دیا، اس میں اپنی برائت ظاہر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

There is something bad within me, and there is something good within me too. When this little bad within me overpowers my goodness, I do bad deeds.

میرے اندر کچھ برائی ہے۔ اسی کے ساتھ میرے اندر کچھ بھلائی بھی ہے، جب میری برائی میری بھلائی پر غالب آجاتی ہے تو اس وقت میں برا کام کر بیٹھتا ہوں۔

قاتل کا یہ جملہ اگر سنجیدہ ذہن کے تحت نکلا ہے تو یقیناً وہ فطرت کی ترجمانی ہے۔ بلاشبہ کچھ مجرم عادی مجرم ہوتے ہیں، ان کو معاف کرنا انسانیت کے اوپر ظلم کرنا ہے۔ مگر بہت سے جرم کرنے والے محض وقتی جذبہ کے تحت جرم کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی فطرت زور کرتی ہے۔ اپنے جرم پر انھیں اس قدر افسوس لاحق ہوتا ہے کہ ان کا افسوس خود ان کے لئے ایک داخلی سزا بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اس بات کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ غلطیوں کو معاف کرو۔ وقتی جذبہ کے تحت جب ایک آدمی کوئی برائی کر بیٹھتا ہے تو اس کے بعد اس کے دل میں خود ہی اس کے خلاف شرمندگی اور افسوس کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اس وقت اگر ہم اس کو معاف کر دیں تو گویا ہم نے اس کے احساس ندامت کو سہارا دیا اور اس کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے اور دوبارہ ایسی غلطی کرنے سے بچے۔

اسلام میں اگرچہ قتل کی سزا قتل ہے تاہم ایک خاص صورت کے ساتھ اس کو قابل معافی بھی رکھا گیا ہے۔ وہ یہ کہ مقتول کے ورثہ اگر قاتل سے دیت لینے پر راضی ہو جائیں تو اس کو دیت لے کر چھوڑ دیا جائے اور اس کو قتل نہ کیا جائے۔

# داعی بننے کے لئے

مائیکل فیراڈے (Michael Faraday) اور لارنس براگ (Lawrence Bragg) عہد جدید کے بہت کامیاب معلم سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دونوں لندن کے راکل انسٹی ٹیوٹ میں پچر دیا کرتے تھے۔

کامیاب لکچر کاراز کیا ہے، اس کے بارے میں دونوں کی یادداشتیں شائع ہوئی ہیں۔ ہم بالترتیب دونوں کا ایک ایک فقرہ یہاں نقل کرتے ہیں جو گویا ان کے تجربات کا خلاصہ ہے۔

I am sorry to say that the generality of mankind cannot accompany us one short hour unless the path is strewn with flowers

میں افسوس کے ساتھ یہ کہوں گا کہ بیشتر انسان ایک گھنٹہ کے مختصر وقت میں بھی ہمارے ہم سفر نہیں بن سکتے الا یہ کہ راستہ پھولوں سے سجایا گیا ہو۔

The essential feature for success of the lecture is the emotional contact between the lecturer and the students

لکچر کی کامیابی کے لئے ضروری بات یہ ہے کہ استاد اور طالب علم کے درمیان جذباتی ربط قائم ہو جائے۔

فیراڈے اور براگ نے جو بات کامیاب معلم بننے کے لئے لکھی ہے، وہی زیادہ شدت کے ساتھ کامیاب داعی بننے کے لئے ضروری ہے۔

داعی اور مدعو کا تعلق بے حد نازک تعلق ہے۔ وہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس کی نزاکتوں کی پوری رعایت نہ کی جائے۔ اپنے مدعو کو اپنا ہم سفر بنانے کے لئے آپ کو اس کے راستہ میں پھول بکھیرنا ہو گا۔ راستہ میں کانٹے اور پتھر بچھا کر آپ مدعو کو اپنا ہم سفر نہیں بنا سکتے۔

اسی طرح اپنی بات کو اس کے لئے قابل سماعت بنانے کی خاطر آپ کو یہ کرنا ہو گا کہ اس کو اتنے موثر انداز میں کہیں کہ آپ کی بات محض ایک خشک تلیقن نہ معلوم ہو بلکہ وہ سننے والے کے لئے ایک ایسا تجربہ بن جائے جس میں وہ اپنے لئے ایک کیفیاتی کشش پاتا ہو۔

## یہ بھی ممکن ہے

برطانی فلسفی راشڈل ہسٹنگز (۱۹۲۴-۱۸۵۸) نے لکھا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی میں جب ابن رشد کی کتابیں یورپ میں پھیلیں تو اس کا فلسفہ عیسائیوں کو اپنے حق میں شدید خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ ۱۲۱۰ء میں پیرس یونیورسٹی کونسل نے ایک متفقہ فیصلہ کیا اور اس کے مطابق ارسطو کی طبیعتی تاریخ اور اس پر لکھی ہوئی ابن رشد کی شرحوں کو تعلیم و تدریس کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ مگر یہ فیصلہ بہت دیر تک باقی نہ رہ سکا۔ کچھ عرصہ بعد یونیورسٹی کے ذمہ داروں کو احساس ہوا کہ انھوں نے ایسا کر کے اپنے طلبہ کو علم کے خزانہ سے محروم کر دیا ہے۔ چنانچہ نہ صرف ممنوعہ کتابیں دوبارہ داخل نصاب کی گئیں بلکہ نئے قاعدہ کے مطابق یونیورسٹی کے فارغ طلبہ سے یہ حلف لیا جانے لگا کہ وہ صرف ان چیزوں کو اپنی تعلیم و تدریس میں استعمال کریں گے جو ابن رشد کی شرح کے مطابق ارسطو کے خیالات سے ہم آہنگ ہو:

Rashdall Hastings, Universities, p. 368

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے اندر کوئی خوبی ہو تو مخالف بھی کس طرح اس کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کچھ لوگ تعصب یا ضد میں ابتداءً آپ کو نہ مانیں تو اس نہ ماننے کو بھی مستقل نہ سمجھئے۔ اگر فی الواقع آپ کے اندر کوئی قابل قدر چیز ہے تو جلد وہ دن آئے گا جب کہ نہ ماننے والے کو اپنے نہ ماننے پر پچھتاوا ہو اور وہ دوبارہ آپ کے اعتراف پر مجبور ہو جائے۔ ابن رشد دتیا میں موجود نہ تھا کہ وہ اپنا دفاع کرے یا اپنے حق کے حصول کے لئے احتجاج و مطالبہ کی جہم چلائے۔ تاہم اس کا عمل لوگوں کے سامنے موجود تھا۔ پیرس یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے ابن رشد کی تعلیم تو بند کر دی۔ مگر بہت جلد ان کو احساس ہوا کہ ابن رشد کی کتابوں کا بدل ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ ابن رشد خواہ ان کے لئے ایک غیر مطلوب انسان ہو مگر اپنی نسلوں کی تعلیم تو بہر حال ان کے لئے ایک مطلوب چیز تھی۔ بالآخر انھیں محسوس ہوا کہ ابن رشد کو چھوڑنا صرف اس قیمت پر ممکن ہے کہ خود اپنی نسلوں کی تعلیم ناقص رہ جائے۔ وہ ابن رشد کو نظر انداز کر سکتے تھے مگر اپنے آپ کو نظر انداز کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ابن رشد کی کتابوں کو دوبارہ اختیار کر لیا۔ کوئی شخص اگر یہ حقیقت حاصل کر لے کہ وہ دوسروں کی ضرورت بن جائے تو دوسرے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے، خواہ یہ دوسرے اس کے حریف کیوں نہ ہوں۔

## غلط استدلال

وکیع بن الجراح (۱۹۷-۱۲۹ھ) اپنے زمانہ کے ایک بڑے محدث تھے۔ وہ نہایت متقی انسان تھے چنانچہ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کو قاضی کا عہدہ پیش کیا تو انھوں نے انکار کر دیا اور اپنی تمام عمر حدیث کی جمع و تدوین میں گزار دی۔ وہ اپنے وطن کوفہ سے حج کے ارادہ سے مکہ روانہ ہوئے تھے کہ راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

وکیع بن الجراح کے ایک معاصر نے (تعریفی طور پر) ان کے بارے میں کہا کہ میں نے وکیع کو دیکھا۔ میں نے ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ وہ حدیثوں کے حافظ تھے (رأیت وکیعاً دماراً یتبیدہ کتاباً قط، انما هو یحفظ، التہذیب لابن حجر، جلد ۱۱ صفحہ ۱۱۹)

گو لڈ زیہرنے اس قول کو لے کر لکھا ہے کہ وکیع نے کتاب اور کاغذ چھوڑ رکھا تھا، وہ صرف زبانی طور پر حدیث سنتے اور سناتے تھے گو لڈ زیہر کا مقصد اس سے حدیث کی صحت کو مشکوک ثابت کرنا ہے۔ کیونکہ تحریر کے مقابلہ میں یادداشت بہر حال ایک غیر معتبر ذریعہ ہے۔

مگر گو لڈ زیہر کا یہ استدلال اس وقت غلط معلوم ہوتا ہے جب کہ ہم اسی کتاب میں یہ دیکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے اپنے شاگردوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا: تمہارے لئے لازم ہے کہ تم وکیع کی کتابوں کو پڑھو (علیکم بمصنفات وکیع، التہذیب لابن حجر جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۶) اگر ان کی کتابیں نہ ہوتیں تو احمد بن حنبل اس طرح کا مشورہ کیوں دیتے۔ امام وکیع کی کتابوں میں سے چند کتابیں یہ ہیں:

کتاب الزہد

المصنف

التفسیر (الکشف والبیان للعلبی)

وکیع بن الجراح کے واقعات بتاتے ہیں کہ ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا۔ وہ اگرچہ احادیث کو باقاعدہ لکھتے تھے۔ مگر مجالس میں اکثر حافظہ کی مدد سے احادیث کو بیان کرتے تھے۔ امام وکیع سے متعلق تمام واقعات کو دیکھئے تو مذکورہ قول میں کوئی ہرج فہر نہیں آتا۔ مگر گو لڈ زیہرنے بقیہ چیزوں کو چھوڑ کر صرف ایک جزر کو لے لیا تو وہ اس کے لئے اس بات کی دلیل بن گیا کہ حدیث کا موجودہ ذخیرہ مشتبہ ذخیرہ ہے، اس کی صحت پر مکمل اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

## تاریخ کا فتنہ

سأل ابو زرعة شيخه البلقيني قال: ما  
تقصير الشيخ تقي الدين السبكي عن الاجتهاد  
وقد استكمل آله - فسكت البلقيني - فقال  
ابو زرعة: فما عندى ان الامتناع عن ذلك  
الا للوظائف التي قدرت للفقهاء على المذهب  
الاربعة وان من خرج عن ذلك لم ينله شيء  
من ذلك وحرمة ولاية القضاء وامتناع الناس  
عن افتائه ونسبت اليه البدعة فاقسم  
البلقيني ووافقه على ذلك (السيد سابق، فقه السنة،  
المجلد الاول، صفحہ ۱۳-۱۴)

ابو زرعة نے اپنے استاد بلقینی سے پوچھا کہ شیخ تقی الدین  
سبکی اجتہاد کیوں نہیں کرتے جب کہ ان کے اندر اس  
کی شرائط موجود ہیں۔ بلقینی چپ رہے۔ ابو زرعة  
نے کہا کہ ان کے اجتہاد سے رکنے کی وجہ میرے  
تذریک تو صرف وہ وظائف ہیں جو مذاہب اربعہ  
کے فقہاء کے لئے مقرر کئے گئے ہیں جو ان مذاہب  
سے نکلے گا وہ ان وظائف میں سے کچھ نہیں پاسکتا،  
وہ قاضی کے عہدہ پر باقی نہ رہے گا، لوگ اس  
کے فتوے کو قبول نہیں کریں گے۔ اور اس کو بدعتی  
کہنے لگیں گے۔ یہ سن کر بلقینی ہنسے اور ان کی رائے  
سے اتفاق کیا۔

دین کے نام پر جو چیز شروع کی جائے، اگر وہ ایک مدت تک باقی رہے تو بالآخر وہ مقدس  
سمجھی جانے لگتی ہے، یہاں تک کہ وہ نوبت آتی ہے کہ اس کے ساتھ دنیوی قدر پیدا ہو جاتی ہے۔  
اس سے منسوب ہو کر آدمی کو ماحول میں عزت ملتی ہے، اس سے وابستگی سے آدمی کے لئے عہدوں اور  
مفادات کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس کے نام پر ”آج“ کے ایک آدمی کو وہ حیثیت حاصل ہو جاتی  
ہے جو ”کل“ کے ایک آدمی کو تاریخی روایات کے نتیجے میں حاصل ہو چکی ہے۔  
ایسے ماحول میں لوگ اس حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جس کے ساتھ تاریخی شخصیت  
کا نام شامل نہ ہو۔ وہ ”تاریخ“ کے پرستار بن کر رہ جاتے ہیں، حق کے پرستار کی حیثیت سے ان کا  
وجود ختم ہو جاتا ہے۔

لوگ ہمیشہ زندہ شخصیت کو نظر انداز کرتے ہیں اور تاریخی طور پر مسلمہ شخصیت کے ساتھ خوب  
تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمہ شخصیتوں کے ساتھ مادی مفادات وابستہ ہو جاتے ہیں،  
جب کہ زندہ شخصیت کے ساتھ اس قسم کا کوئی پہلو وابستہ نہیں ہوتا۔

## جب جھٹکا لگتا ہے

ابتدائی زمانہ کے ترک سلطان بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ وہ لوگوں کے درمیان ایک عام انسان کی طرح رہتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ دربار میں بھی کسی غیر معمولی اہتمام کے بغیر بیٹھتے تھے۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا اور اس نے ترک سلاطین کے انداز کو بالکل بدل دیا۔

سلطان محمد ثانی (۱۴۵۱-۱۴۸۱) وہ ترک حکمران ہے جس نے قسطنطنیہ کو فتح کیا اور اس کے بعد سلطان محمد فاتح کے عظیم نام سے مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے وزیروں کے ساتھ مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس اثنا میں ایک کسان کوئی فریاد لے کر حاضر ہوا۔ یکساں قسم کے لوگوں کے درمیان وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کس سے مخاطب ہو۔ اس نے کہا:

تم میں سے سلطان کون ہے

سلطان محمد فاتح نے ایک دیہاتی کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو وہ اس کو بہت ناگوار گزرے۔ اس نے محسوس کیا کہ دیہاتی نے بھرے مجمع میں اس کی توہین کر دی۔ وہ اٹھ کر خاموشی سے اپنے محل کے اندر چلا گیا۔ اس کی سادہ مزاجی پر اس کا احساس سلطانی غالب آگیا اور اس کے بعد سے اس نے وزیروں اور درباریوں کی مجلس میں بیٹھنا بند کر دیا۔

سلطان نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ لوگوں سے الگ ایک دریچے کے پیچھے بیٹھتا اور وہاں بیٹھ کر اپنے وزیروں کی باتیں یا لوگوں کی درخواستیں سنتا۔ دھیرے دھیرے مزید تبدیلی آئی اور بعد کو یہ اصول بھی باقی نہ رہ سکا۔

سلطان سلیمان اعظم (۱۵۶۶-۱۵۲۰) کے دور سے ایسا ہوا کہ سلاطین ترکی نے وزیروں کی مجلس میں شرکت بالکل بند کر دی۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ وزیر ار کی مجلس صدر اعظم کے ساتھ بیٹھ کر بحث و مشورہ کرتی اور اس کے بعد وہ جس فیصلہ تک پہنچتی اس کو صدر اعظم سلطان تک پہنچا دیتا۔ سلطان اس کو سن کر اپنا حکم سنا دیتا جو اس باب میں آخری ہوتا۔

آدمی بظاہر اچھا ہوتا ہے۔ وہ دیکھنے والوں کو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ صورت حال اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کوئی جھٹکا نہ پڑے۔ جب اس کے نفس کو کوئی جھٹکا لگتا ہے تو اس کے بعد وہ بدل کر دوسرا انسان بن جاتا ہے۔

## حالات کے نتیجہ میں

امام مالک سے پوچھا گیا کہ جبری طور پر کسی سے طلاق لی جائے تو طلاق واقع ہوگی یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جبری طلاق طلاق نہیں ہے۔ یہ خلیفہ منصور کا زمانہ تھا۔ مدینہ میں اس کا جو گورنر تھا اس نے امام مالک کو ایسا فتویٰ دینے سے روکا۔ مگر امام مالک نہ مانے۔ اس کے بعد گورنر نے حکم دیا کہ امام مالک کو نوے کوڑے مارے جائیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور ان کی پیٹھ ننگی کر کے اس پر ۹۰ کوڑے مارے گئے (مرآۃ الجنان) کوڑے کی مار سے اگرچہ امام مالک کی پیٹھ خون آلود ہو گئی تھی۔ لیکن گورنر نے دیکھا کہ اب بھی امام مالک کے اندر کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس نے حکم دیا کہ ان کے پاؤں میں زنجیر ڈالی جائے اور جہرہ پر سیاہی لگا کر مدینہ کے راستوں میں گھمایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اونٹ پر بٹھا کر ان کو مدینہ کے راستوں میں گھمایا گیا۔ امام مالک کا حال یہ تھا کہ اس وقت بھی وہ کہتے جاتے تھے: جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے کہ میں اور جو نہیں جانتا تو میں مالک بن انس ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ زبردستی کی طلاق کچھ نہیں ہے (من عرفنی فقد عرفنی ومن لم یعرفنی فانا مالک بن انس، اقول ان طلاق المکسر کا لیس بشی)۔

ایک خالص غیر سیاسی فتوے پر وقت کے سیاسی حاکم نے اتنا شدید رد عمل کیوں ظاہر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فتویٰ اگرچہ بذات خود غیر سیاسی تھا۔ مگر وقت کے مخصوص حالات کی وجہ سے اس کے اندر سیاسی اہمیت پیدا ہو گئی تھی۔

اس زمانہ میں عملاً نسلی بادشاہت چل پڑی تھی۔ تاہم اسلام کے اثر سے حکمران اس کو بھی ضروری سمجھتے تھے کہ وہ لوگوں سے بیعت لیں اور عوام کو یہ تاثر دیں کہ وہ عوامی رائے سے خلیفہ بنے ہیں نہ کہ محض شاہی خاندان سے تعلق کی وجہ سے۔ مگر عوام ان حکمرانوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ خلفاء جبری طور پر لوگوں سے بیعت لیتے تھے۔ اس پس منظر میں امام مالک کا فتویٰ بہت معنی خیز تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جبری طلاق جس طرح بے اعتبار ہے اسی طرح جبری بیعت بھی بے اعتبار ہے۔ گورنر کو اندیشہ ہوا کہ امام مالک کے فتوے کی وجہ سے خلیفہ کی بیعت لوگوں کی نگاہ میں غیر معتبر نہ ہو جائے۔ اسی لئے اس نے اس کا اتنا سخت نوٹس لیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک خالص غیر سیاسی مسئلہ بھی مخصوص حالات کے نتیجہ میں سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں مشرک بادشاہوں کا دعوتِ توحید کے خلاف شدید رد عمل بھی اسی قسم کے حالات کا نتیجہ تھا۔

# قومی کردار

۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ ہندوستان کے ایک صنعت کار مغربی جرمنی گئے۔ وہاں ان کو ایک کارخانہ میں جانے کا موقع ملا۔ وہ ادھر ادھر گھوم کر کارخانہ کی کارکردگی دیکھتے رہے۔ اس درمیان میں وہ ایک کاریگر کے پاس کھڑے ہو گئے اور اس سے کچھ سوالات کرنے لگے۔ بار بار خطاب کرنے کے باوجود کاریگر نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ بدستور اپنے کام میں لگا رہا۔

کچھ دیر کے بعد کھانے کے وقفہ کی گھنٹی بجی۔ اب کاریگر اپنی مشینوں سے اٹھ کر کھانے کے ہال کی طرف جانے لگے۔ اس وقت مذکورہ کاریگر ہندوستانی صنعت کار کے پاس آیا۔ اس نے صنعت کار سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد تعجب کے ساتھ کہا: کیا آپ اپنے ملک کے کاریگروں سے کام کے وقت بھی باتیں کرتے ہیں۔ اگر اس وقت میں آپ کی باتوں کا جواب دیتا تو کام کے چند منٹ ضائع ہو جاتے اور کمپنی کا نقصان ہو جاتا۔ جس کا مطلب پوری قوم کا نقصان تھا۔ ہم یہاں اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے آتے ہیں، ملک کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں آتے۔

یہی وہ کردار ہے جو مغربی قوموں کی ترقی کا راز ہے۔ ۱۹۴۵ میں اتحادی طاقتوں (الائنڈ پاورس) نے جرمنی کو بالکل تباہ کر دیا تھا، مگر صرف ۲۵ سال بعد جرمنی دوبارہ پہلے سے زیادہ طاقت ور بن چکا ہے اور اس ترقی کا راز یہی ہے کہ وہاں کا ہر فرد اپنی یہ ذمہ داری سمجھتا ہے کہ وہ اپنی ڈیوٹی کو بخوبی طور پر انجام دے۔ وہ اپنی ذات کو اپنی قوم کے تابع سمجھتا ہے۔ ہر آدمی اپنی ذات کی تکمیل میں لگا ہوا ہے۔ مگر قومی مفاد کی قیمت پر نہیں بلکہ ذاتی جدوجہد کی قیمت پر۔ جہاں ذات اور قوم کے مفاد میں ٹکراؤ ہو، وہاں وہ قوم کے مفاد کو ترجیح دیتا ہے، اور اپنی ذاتی خواہش کو دبا لیتا ہے۔

قوم کی حالت کا انحصار ہمیشہ فرد کی حالت پر ہوتا ہے۔ فرد کے بننے سے قوم بنتی ہے اور فرد کے بگڑنے سے قوم بگڑ جاتی ہے۔ قوم کا معاملہ وہی ہے جو مشین کا معاملہ ہوتا ہے۔ مشین اسی وقت صحیح کام کرتی ہے جب کہ اس کے پرزے صحیح ہوں۔ اسی طرح قوم اس وقت درست رہتی ہے جب کہ اس کے افراد اپنی جگہ پر درست کام کر رہے ہوں۔ مشین بنانا یہ ہے کہ پرزے بنائے جائیں۔ اسی طرح قوم بنانا یہ ہے کہ افراد بنائے جائیں۔ فرد کی اصلاح کے بغیر قوم کی اصلاح اسی طرح ناممکن ہے جس طرح پرزے تیار کئے بغیر مشین کھڑی کرنا۔

# نظام تعلیم

چارلس ایڈمس ایک امریکی عیسائی تھے۔ انھوں نے مصر میں رہ کر وہاں کی اسلامی تحریکوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے:

Islam and Modernism in Egypt

اس کتاب میں ایک جگہ وہ جامعہ ازہر (قاہرہ) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”روایت پرستی کی روح صدیوں سے جامعہ ازہر کی تعلیمی سرگرمیوں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ علمی تحقیق اور چھان بین کے ذریعہ متعلقہ علوم کو ترقی دی جائے۔ تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قدامت کا ذہنی سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہے، بعینہ اسی حالت میں جیسا کہ اسلاف نے اپنے بعد والوں کو دیا تھا۔ آزادانہ تحقیق اور آزادانہ رائے قائم کرنے کا دروازہ اسلام میں تیسری صدی ہجری سے بند ہے۔ اس لئے مذہب کے مستند شارحین صرف دور ماضی میں ملتے ہیں اور بعد والوں کے لئے صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے علمی سرمایہ کی شرح کرتے رہیں۔“

اس کتاب کی اشاعت کے بعد مصر کی جامعہ ازہر میں کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں مصنف کا تبصرہ اب اس پر صرف جزئی طور پر ہی صادق آتا ہے۔ تاہم ہندستان اور دوسرے بہت سے ملکوں کے اسلامی مدارس کے لئے یہ الفاظ آج بھی پوری طرح درست ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اسلامی تعلیم کا معاملہ عام سیکولر تعلیم سے مختلف ہے۔ سیکولر تعلیم مطلق طور پر آزادانہ تحقیق کی قائل ہے۔ جب کہ اسلامی تعلیم کی بنیاد ہمیشہ قرآن و سنت پر ہوتی ہے۔ مگر ہمارے مدارس میں آج جو تعلیم دی جا رہی ہے اس کے متعلق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اس کی بنیاد کتاب و سنت پر نہیں بلکہ ایک خاص دور میں پیدا ہونے والے کتاب و سنت کے شارحین پر ہے۔ کتابوں کی ایک خاص فہرست ہے جن کو مقدس مقام حاصل ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب قرآن و حدیث بھی انھیں کتابوں کی روشنی میں پڑھائے جاتے ہیں نہ کہ ان کتابوں کو قرآن و حدیث کی روشنی میں پڑھایا جائے۔

اس طرز تعلیم کا براہ راست نتیجہ جمود اور تنگ نظری ہے۔ یہ جمود اور تنگ نظری آج مسلم قوم کا سب سے بڑا خاصہ بن چکی ہے اور ہم اس کے وہ تمام نتائج بھگت رہے ہیں جو ایسی ذہنیت سے لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

## کامیابی کا راز

ایک جاہل شخص ہندوستان سے عراق گیا۔ وہاں سے وہ دو سال کے بعد واپس آیا تو ایک آدمی نے پوچھا کہ کتنا پیسہ کمایا؟ اس نے کہا کہ میں زیادہ تو نہیں کمایا۔ پھر بھی کھاپی کر پچاس ہزار روپے لایا ہوں۔ آدمی نے دوبارہ پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ پیسہ حاصل کرنے کا راز کیا ہے۔ اس نے جواب دیا:

بھائی صاحب، میں نے تو یہ جانا کہ من مارو گے تو منی پاؤ گے۔

منی (دولت) پانے کا راز یہ ہے کہ آدمی صبر کے ساتھ کام کرے، اپنے ذوق پر چلنے کے بجائے دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے جدوجہد کرے۔ کیونکہ دولت حاصل کرنے کا مطلب دوسروں کی جیب سے دولت نکالنا ہے۔ پھر اگر آپ دوسروں کی رعایت نہ کریں گے تو دوسرا شخص آپ کو یہ موقع کیوں دے گا کہ آپ اس کی جیب کی دولت نکال کر اپنی جیب میں ڈالیں۔

دولت حاصل کرنے کا راز من کو مارنا ہے۔ اپنے ذوق پر چلنے کے بجائے دوسرے کے ذوق پر چلنا ہے۔ یہی بات دوسرے مقاصد کے لئے بھی صحیح ہے اور یہی بات دینی مقصد کے لئے بھی۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسرے بہت سے لوگوں کے درمیان کام کرنا پڑتا ہے۔ اپنے سے باہر بہت سے حالات سے مقابلہ کر کے اپنا سفر جاری کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں کوئی کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ نہ ہو کہ آدمی اپنے ذاتی خول سے باہر آئے، وہ اپنی من مانی کارروائی کرنے کے بجائے دوسرے افراد اور خارجی حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنا راستہ نکالے۔ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کر لے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں آدمی اپنے آپ کو کچل کر دوسرے کو پاتا ہے۔ خارجی تقاضوں کا اعتراف کر کے وہ خارج سے اپنا اعتراف کروانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اپنے سے باہر کی دنیا کو کچھ دینے کے بعد ہی اس کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ باہر کی دنیا سے اپنے آپ کے لئے کچھ پاسکے۔

## یہ تضاد کیوں

آسمان کے نیچے ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ یہاں داداگیری کی صلاحیت کا استعمال ہے مگر سنجیدگی کی صلاحیت کا کوئی استعمال نہیں۔ یہاں شاطر آدمی اپنی پوری قیمت پالیتا ہے مگر شریف آدمی کو یہاں کوئی قیمت نہیں ملتی۔ ہر ایک کو خوش کرنے والی زبان بولنے والے کو یہاں خوب مقبولیت حاصل ہوتی ہے مگر جو شخص غیر مصلحت پرستانہ انداز میں بولے اور حق کو حق اور باطل کو باطل کہے اس کو یہاں کوئی عزت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔

یہ سب ایک ایسی دنیا میں ہو رہا ہے جو اپنی ذات میں بالکل بے عیب ہے۔ جہاں درخت کمال کا ایک انتہائی خوش منظر نمونہ بنے ہوئے کھڑے ہیں۔ جہاں چڑیاں اس کے سوا کوئی اور بولی نہیں جانتیں کہ وہ حسن اور سلامتی کے نغمے گائیں۔ جہاں سورج اور چاند صرف روشنی بکھیرتے ہیں، ان کو تاریکی بکھیرنا اور اندھیرا پھیلانا نہیں آتا جہاں ستارے صرف اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں، کوئی ستارہ دوسرے کے مدار میں داخل ہو کر وہاں اپنا جھنڈا گاڑنے کے لئے نہیں دوڑتا۔

انسان اور بقیہ کائنات میں یہ تضاد دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یہاں دو خدا ہیں، ایک نور کا اور دوسرا ظلمت کا۔ کسی نے کہا کہ یہاں کوئی خدا ہی نہیں۔ اگر کوئی خدا ہوتا تو دنیا میں یہ الٹا نظام کیوں کر جاری رہتا۔

مگر صحیح یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ مثالی دنیا اس کے بعد آنے والی ہے اور انسان کے سوا بقیہ کائنات اسی کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔ امتحان کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ انسان کو عمل کی پوری آزادی ہو۔ اسی آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اور کچھ لوگ ٹیڑھے راستے پر چلتے ہیں، مگر قیامت کے بعد جب مثالی دنیا قائم ہوگی تو وہاں وہی لوگ جگہ پائیں گے جنہوں نے موجودہ دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا ہو گا کہ وہ مثالی انداز میں سوچنے اور مثالی کردار کے ساتھ زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بقیہ تمام لوگ چھانٹ کر اسی طرح دودھ پینک دے جائیں گے جیسے کوڑا کرکٹ سمیٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

# ایک شہر، دو کہانی

ستمبر ۱۹۸۲ میں ملک کے ایک شہر میں فساد ہوا۔ جانیں ضائع ہوئیں۔ دکان اور مکان جلا دیے گئے۔ تجارتوں اور صنعتوں کو تقریباً ایک ارب روپے کا نقصان پہنچا۔ اور ان تمام نقصانات میں ۹۰ فی صد سے زیادہ حصہ مسلمانوں کا تھا۔

مگر اسی شہر میں ایک مدرسہ ہر قسم کے نقصان سے بالکل محفوظ رہا۔ ایک ہی شہر میں دو قسم کے انجام کا راز صرف یہ تھا کہ شہر کے بقیہ مسلمانوں نے مقابلہ آزادی کی پالیسی پر عمل کیا اور مدرسہ والوں نے صبر کی پالیسی پر۔ یہ مدرسہ ”دشمنوں“ کے علاقہ میں تھا۔ وہ ہر طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ عین اس وقت جب کہ سارے شہر میں قیامت برپا تھی، ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲ء کی رات کو دس بجے تقریباً پانچ سو آدمیوں کا غول آیا اور مدرسہ کو گھیر لیا۔ وہ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ مدرسہ میں آگ لگا دو، ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑ دو وغیرہ۔ مدرسہ کے پاس ایک میدان میں کنکر پتھر کافی پڑے ہوئے تھے۔ یہاں سے اٹھا اٹھا کر ان لوگوں نے مدرسہ میں پتھر پھینکنے شروع کئے۔ ۸۔۱۰ آدمی مدرسہ کی چھت پر چڑھ گئے اور اوپر سے چیخنا شروع کیا۔

اس حالت میں مدرسہ والوں نے کیا کیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ فسادیوں کا غول ان کی طرف آ رہا ہے تو پہلے سے سوپے ہوئے منصوبہ کے مطابق انھوں نے تمام روشنیاں بجھا دیں۔ حالات کے تحت انھیں قطعی اندیشہ تھا کہ فسادی ان کے اوپر حملہ کرنے آئیں گے۔ انھوں نے باہم مشورہ سے طے کیا تھا کہ جب ایسا ہو گا تو ہم مدرسہ میں بالکل اندھیرا کر دیں گے اور کمروں میں داخل ہو کر یہ آیت پڑھنا شروع کریں گے: لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ہم اس وقت تک کوئی جوابی کارروائی نہ کریں گے جب تک وہ بالکل ہمارے پاس نہ آجائیں۔

فسادیوں کا غول پتھر پھینک رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا اور مدرسہ کے تمام لوگ روشنیاں بجھا کر اپنے کمروں میں آیت قرآنی کا ورد کر رہے تھے۔ شہر کے عام مسلمانوں کے برعکس مدرسہ والوں کی اس خاموشی نے فسادیوں پر رعب ڈال دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ کوئی گہری سازش ہے اور انھوں نے کوئی خاص تیاری کر رکھی ہے جس کو وہ اس وقت سامنے لائیں گے جب کہ ہم لوگ اندر داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ مجمع کی طرف سے کچھ لوگوں نے پکار کر کہنا شروع کیا ”واپس چلو، آگے نہ بڑھو، ورنہ تم میں سے کوئی پنج کر نہیں جائے گا“ اس کے بعد چھت پر چڑھنے والے نیچے اتر آئے اور سارے کے سارے فسادی جدھر سے آئے تھے ادھر ہی واپس چلے گئے۔

## تلوار سے زیادہ

سابق صدر مصر انور سادات (۱۹۸۱-۱۹۱۸) کے قتل کے بعد امریکہ کے ٹائم میگزین (۱۹ اکتوبر ۱۹۸۱) نے اس واقعہ کے بارے میں خصوصی مضمون شائع کیا تھا۔ اس مضمون کا آغاز اس نے پولین کے ایک قول سے کیا۔ پولین نے اپنے آخری زمانہ میں سوال کیا: ”کیا تم جانتے ہو کہ دنیا کے بارے میں کیا چیز مجھے سب سے زیادہ تعجب میں ڈالتی ہے“ اس کے بعد خود ہی جواب دیا کہ وہ چیز طاقت کی یہ بے بسی ہے کہ اس کے ذریعہ کسی چیز کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ بالآخر ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ تلوار کو فتح کر لیتا ہے:

In the end, the sword is always conquered by the mind

انور سادات نے مصر میں ہر قسم کی طاقت حاصل کر لی مگر ۶ اکتوبر ۱۹۸۱ کو وہ عین اس وقت قتل کر دئے گئے جب کہ قاہرہ میں وہ اپنی تمام افواج کے ساتھ فتح سوئز (۱۹۷۳) کی تقریب منارہے تھے۔ انور سادات کی عالی شان نشست گاہ میں آنے والے تمام لوگوں کی جانچ مخصوص آلات (Metal Detector) کے ذریعہ کی جا رہی تھی جتنی کہ پریڈ میں حصہ لینے والے تمام فوجیوں کی رائفلوں کو کارٹوس سے خالی کر دیا گیا تھا۔ مگر سادات کی فوج ہی کا ایک آدمی پریڈ سے نکل کر تیزی سے ڈاس کی طرف آیا اور قبل اس کے حفاظتی عملہ اس کو روکے وہ سادات کو اپنی گولی کا نشانہ بنا چکا تھا۔

یہ واقعہ تلوار کے اوپر دماغ کی فتح کا واقعہ تھا، انور سادات کے کچھ مخالفین نے یہ تصور پھیلایا کہ انور سادات مرتد ہو چکے ہیں اور شریعت اسلام کے مطابق مرتد شخص قتل کا مستوجب ہوتا ہے۔ یہ تصور فوج تک پہنچا۔ لفٹننٹ خالد استانبولی شدت کے ساتھ اس سے متاثر ہوا۔ اس نے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے خفیہ منصوبہ بنایا اور فتح کی پریڈ کے دن منصوبہ کے مطابق سادات کو گولی مار کر قتل کر دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ذہن تلوار سے زیادہ طاقت ور ہے۔ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مگر تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان نے اس ذہن کو زیادہ تر منفی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ مثبت مقاصد کے لئے ذہن کو استعمال کرنے کی مثالیں تاریخ میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر عمل کرنے والوں نے انسانیت کو صرف تخریب کا تحفہ دیا ہے۔ بہت کم عمل کرنے والے ہیں جن کے عمل سے انسانیت کو تعمیر کا تحفہ ملا ہو۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا  
 كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالٍ  
 ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ  
 مُبِينٍ ۝ الْإِنَّا أَوْلِيَاءُ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا  
 كَانُوا يَتَّقُونَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ  
 لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ وَلَا يَحْزُنُكَ قَوْلُهُمْ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ  
 جَمِيعًا ۝ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

اور تم جس حال میں بھی ہو اور قرآن میں سے جو حصہ بھی سنارہے ہو اور تم لوگ جو کام بھی کرتے ہو، ہم تمہارے  
 اوپر گواہ رہتے ہیں جس وقت تم اس میں مشغول ہوتے ہو۔ اور تیرے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز غائب  
 نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔ سن لو،  
 اللہ کے دوستوں کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور  
 ڈرتے رہے، ان کے لئے خوش خبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں، اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی  
 نہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور تم کو ان کی بات غم میں نہ ڈالے۔ زور سب اللہ ہی کے لئے ہے، وہ سنتے  
 والا جاننے والا ہے ۶۵-۶۱

دعوت اس دنیا کے تمام کاموں میں مشکل ترین کام ہے۔ داعی اپنے پورے وجود کو دعوتی عمل میں  
 شامل کرتا ہے، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی پیغام کا داعی بن سکے۔ اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ  
 وہ ہے جو مخاطبین کی طرف سے پیش آتا ہے۔

داعی جب خدا کے دین کو بے آمیز صورت میں پیش کرتا ہے اور اس کو کھلے دلائل کی زبان میں مبرہن  
 کر دیتا ہے تو وہ تمام لوگ بھراٹھتے ہیں جو خود ساختہ دین کو خدا کا دین بتا کر دیندار بنے ہوئے ہوں یا دینی  
 پیشوائی کا مقام حاصل کئے ہوئے ہوں۔ وہ داعی کو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے بنیاد پروپیگنڈا،  
 سازشیں، حتیٰ کہ جارحانہ کارروائیاں، ہر چیز کو وہ اپنے لئے جائز کر لیتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں ملی ہوئی آزادی  
 انہیں موقع دیتی ہے اور وہ داعی کے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ صورت حال یہاں  
 تک پہنچتی ہے کہ دلیل کی طاقت تمام تر ایک طرف ہو جاتی ہے اور مادیات کی طاقت تمام تر دوسری طرف۔

یہ صورت حال بلاشبہ بے حد سخت ہے۔ اس کے بعد ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ مخالفین حق کے جو صلے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے کو کامیاب سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف داعی پر بھی یہ خیال گزرتا ہے کہ کیا خدا اس معاملہ میں غیر جانب دار ہے۔ کیا وہ مجھے حق و باطل کے اس معرکہ میں ڈال کر خود علیحدہ ہو گیا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا حق کا ساتھ نہ دے۔ مخالفین کا بے دلیل ہو جانا اور دلیل کی قوت کا تمام ترداعی کی طرف ہونا یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا داعی کے ساتھ ہے نہ کہ دوسرے گروہ کے ساتھ۔ کیونکہ دلیل موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ جس کے ساتھ دلیل ہے اس کے ساتھ گویا خدا ہے۔ مخالفین حق کو جارحیت کا موقع صرف اس آزادی کی وجہ سے مل رہا ہے جو امتحان کی خاطر انہیں دی گئی ہے۔ امتحانی دنیا کے ختم ہوتے ہی یہ صورت حال بدل جائے گی۔ اس وقت عزت و برتری اس کے لئے ہوگی جو دلیل کی بنیاد پر کھڑا ہوا تھا۔ جو لوگ دلیل سے خالی تھے وہ وہاں کی دنیا میں رسوا اور ناکام ہو کر رہ جائیں گے۔ اللہ کے سچے داعیوں کا گروہ خدا کے دوستوں کا گروہ ہے۔ اللہ ان کو آخرت میں ایک ایسی اعلیٰ زندگی کی خوش خبری دیتا ہے جہاں نہ انہیں پھیلی زندگی کے لئے کوئی پھپھتاوا ہوگا اور نہ اگلی زندگی کے لئے کوئی اندیشہ۔

الْاِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاءُ اِنْ يَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝۶۱ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝۶۲

سنو، جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب اللہ ہی کے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے سوا شریکوں کو پکارتے ہیں وہ کس چیز کی پیروی کر رہے ہیں، وہ صرف گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ محض اٹکل دوڑا رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم سکون حاصل کرو۔ اور دن کو روشن بنایا۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں ۶۱-۶۲

زمین و آسمان کے پیچھے کون ہے جو اس کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو چلا رہا ہے۔ یہ سوال ہر زمانہ میں انسان کی تلاش کا مرکزی نکتہ رہا ہے۔ مگر اس سوال کا صحیح جواب پانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی مادی و طبیعیات دنیا تک دیکھ سکے اور مادی و طبیعیات تک دیکھنے والی آنکھ کسی کو حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ جواب جو وہ بطور خود قائم کرتا ہے وہ محض قیاس و گمان کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ

حقیقی علم کی بنیاد پر۔

اس دنیا میں حقیقی علم کی بنیاد پر بولنے والے صرف وہ لوگ ہیں جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مخصوص لوگ ہیں جن کا ربط عالم بالا سے براہ راست قائم ہوتا ہے۔ خدا خود انہیں اپنی طرف سے حقیقت کی خبر دیتا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں پیغمبر کا علم ہی واحد علم ہے جس پر یقینی طور پر بھروسہ کیا جاسکے۔ پیغمبروں کے دعوے کی صداقت کو جانچنے کے لئے اگرچہ ہمارے پاس کوئی براہ راست ذریعہ نہیں ہے۔ تاہم ایک بالواسطہ ذریعہ یقینی طور پر موجود ہے۔ اور وہ کائنات کی آیات (نشانیوں) ہیں۔ یہ نشانیاں پیغمبروں کے بیان کردہ معنوی حقائق کی علمی تصدیق کر رہی ہیں۔

مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زمین پر رات کے بعد دن آتا ہے اور دن کے بعد رات آتی ہے۔ یہ گردش ایک انتہائی محکم نظام کی وجہ سے وجود میں آتی ہے جو ریاضیاتی صحت کی حد تک منظم ہے۔ مزید یہ کہ یہ گردش حیرت ناک حد تک ہماری زندگی کے موافق ہے۔ اس کے پیچھے واضح طور پر ایک با مقصد منصوبہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ صورت حال یقینی طور پر ایک ایسے قادر مطلق اور رحمان و رحیم کے وجود کا ثبوت ہے جس کی خبر پیغمبر دیتے ہیں۔

جو لوگ اپنے خیال کے مطابق ”شریکوں“ کی پیروی کر رہے ہیں، وہ شرکار خواہ قدیم الہیاتی شرکار ہوں یا جدید مادی شرکار، وہ کسی واقعی حقیقت کی پیروی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ صرف اپنے قیاس و گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر ہونے والی حقیقت کی تصدیق ساری کائنات کر رہی ہے مگر ”مشرکین“ جس چیز کے مدعی ہیں اس کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ ۖ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا اَتَقُولُوْنَ عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَقْتُرُوْنَ عَلٰی اللّٰهِ الْکُذْبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿۱۹﴾ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُنْزِلُہُمْ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ ﴿۲۰﴾

وَالَّذِیْنَ یَقْتُرُوْنَ عَلٰی اللّٰهِ الْکُذْبَ لَا یُفْلِحُوْنَ

کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔ وہ پاک ہے، بے نیاز ہے۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ کیا تم اللہ پر ایسی بات گھڑتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ کہو، جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ ان کے لئے بس دنیا میں تھوڑا فائدہ اٹھالینا ہے۔ پھر ہماری ہی طرف ان کا لوٹنا ہے۔ پھر ان کو ہم اس انکار کے بدلے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ۴۸-۵۰

خدا کے لئے بیٹے بیٹیاں ماننا خدا کو انسان کے اوپر قیاس کرنا ہے۔ انسان کیوں اور محدودیتوں کا شکار ہے، اس لئے اس کو اولاد کی ضرورت ہے تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کی تلافی کرے مگر خدا کے معاملہ میں یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے۔

مخلوقات کا نظام خود ہی اس قسم کے خالق کی تردید ہے۔ مخلوقات کا عالمی نظام جس خدا کی شہادت دے رہا ہے وہ یقینی طور پر ایک ایسا خدا ہے جو اپنی ذات میں آخری حد تک کامل ہے۔ وہ ہر قسم کے عیبوں اور کمیوں سے پاک ہے۔ خدا اگر اپنی ذات میں کامل نہ ہوتا، اگر وہ عیبوں اور کمیوں والا خدا ہوتا تو کبھی وہ موجودہ کائنات جیسی کائنات کو نہیں بنا سکتا تھا اور نہ اس کو اس طرح چلا سکتا تھا جس طرح وہ انتہائی معیاری صورت میں چل رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر جس خدائے واحد کا تصور پیش کر رہا ہے اس کا وجود تو زمین و آسمان کی تمام نشانیوں سے ثابت ہے۔ مگر مشرکین نے خدا کا جو تصور بنا رکھا ہے، اس کا کوئی ثبوت موجودہ کائنات میں موجود نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ بے ثبوت خدا کو ماننا خود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو خدا سرے سے موجود نہ ہو وہ کیسے کسی کی مدد پر آئے گا اور کیسے کسی کو باراد کرے گا۔ جو خدا حقیقی طور پر موجود ہے، مشرکین اس کو مانتے نہیں، اور جس خدا کو مانتے ہیں اس کا کہیں وجود نہیں۔ ایسی حالت میں مشرکین موجودہ کائنات میں کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کے لئے جو واحد انجام مقدر ہے وہ صرف یہ کہ بالآخر وہ بے بس اور بے سہارا ہو کر رہ جائیں اور ہمیشہ کے لئے ذلت و ناکامی میں پڑے رہیں۔ موجودہ دنیا میں انکار یا شرک کا رویہ اختیار کرنے سے کسی کا کچھ بگڑتا نہیں۔ اس سے آدمی غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ مگر موجودہ صورت حال صرف امتحان کی مہلت کی بنیاد پر ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو امتحان کی وجہ سے عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوگی موجودہ صورت حال بھی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت آدمی دیکھے گا کہ اس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں ہے جس کا وہ اپنے آپ کو مالک سمجھ کر سرکش بنا ہوا تھا۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے عقل سے کہا: ”اے عقل، اس کائنات میں میں نے تجھ سے افضل، تجھ سے حسین اور تجھ سے بہتر مخلوق پیدا نہیں کی۔“ انسان کو ایسی عظیم نعمت دینے کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی عظیم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے نزدیک سچائی کا انکار سب سے بڑا جرم ہے۔ سچائی کو جب دلیل سے ثابت کر دیا جائے تو آدمی کے اوپر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو مانے۔ عقلی طور پر ثابت شدہ ہو جانے کے بعد اگر وہ سچائی کا انکار کرتا ہے تو وہ ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ خدا نے جب انسان کو ایسی عقل دی جس سے وہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا جان سکے تو اس کے بعد کیا چیز ہوگی جو خدا کے یہاں اس کے لئے عذر بن سکے۔

## تضاد کی زمین پر

۱۹۷۷ء کے الیکشن میں کانگریس کو شکست ہوئی اور ہندستان میں جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں ایک مسلمان کانگریسی لیڈر نے دہلی میں ”ملت بچاؤ“ کے نام پر ”جیل بھرو“ کی تحریک چلائی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ جب تک ہماری مانگیں پوری نہ ہوں ہماری تحریک جاری رہے گی۔

جلدی جنتا پارٹی کی حکومت ختم ہو گئی اور کانگریس پارٹی کی حکومت دوبارہ قائم ہو گئی۔ ملت کے تمام مسائل اب بھی بدستور پوری شدت کے ساتھ موجود تھے۔ مگر جنتا حکومت کے خاتمہ کے ساتھ مذکورہ لیڈر کے مطالبات بھی ختم ہو گئے۔ جنتا پارٹی کے زمانہ میں جیل بھرو کی تحریک چلانے والے مجاہد نے کانگریس کی حکومت کے زمانہ میں راجیہ سبھا کی کرسی شکرہ کے ساتھ قبول کر لی۔

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم لیڈر اسی قسم کے تضاد پر زندہ ہیں۔ ان کو جو لیڈری حاصل ہے وہ صرف ان کے تضاد کی قیمت ہے نہ کہ فی الواقع ان کی حق پرستی کی قیمت۔

ایک بزرگ ہندستان میں اس ہم کی قیادت کریں گے کہ کسی دینی ادارہ میں صدر کا بیٹا صدر نہ ہو۔ مگر عرب میں جا کر وہ اس پر راضی ہو جائیں گے کہ ایک بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا ملک کا بادشاہ بنے۔ ایک قائد پاکستان میں عوامی جمہوریت کی تحریک چلائیں گے مگر ٹیروڈالر کے دیس میں غیر جمہوری نظام کے ساتھ سازگاری کر لیں گے۔ ایک جماعت مصر اور شام میں ”مکمل اسلام“ سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوگی۔ مگر اسی جماعت کے افراد دولت مند عرب ممالک میں جزئی اسلام پر مطمئن ہو کر بڑے بڑے مشاہیرے قبول کر لیں گے۔

یہی موجودہ زمانہ میں تمام اسلامی شخصیتوں اور مسلم جماعتوں کا حال ہے۔ وہ ایک مقام پر جس باطل کے خلاف جھنڈا اٹھانے کے چیمپین بنیں گے، دوسرے مقام پر اسی باطل کی موجودگی پر خاموش رہیں گے، صرف اس لئے کہ اس خاموشی کی قیمت ان کو اعزازات اور مفادات کی صورت میں مل رہی ہے۔

مگر ہمارے ان قائدین اور مفکرین کو جاننا چاہئے کہ تضاد کی زمین پر صرف شخصی عظمت کا محل کھڑا ہوتا ہے، ملت کی عظمت کا محل کبھی تضاد کی زمین پر کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔

## زبان والے بے زبان ہو جائیں گے

قدیم عرب میں ایک شخص جمیل بن معمر الجحی تھا۔ وہ بہت ذہین آدمی تھا۔ اس کے اندر یہ عجیب صلاحیت تھی کہ وہ دو متضاد نقطہ نظر پر یکساں قدرت کے ساتھ تقریر کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس کا نام ذوالقلبین (دو دل والا) پڑ گیا۔

اس قسم کے کردار مختلف شکلوں میں ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں۔ مگر ذوالقلبین ہونا خدا کے مقرر کئے ہوئے فطری نقشہ سے انحراف کرنا ہے۔ یہ خدا کی دنیا میں ایک ناپسندیدہ چیز ہے نہ کہ کوئی پسندیدہ چیز۔ اسی لئے قرآن میں فرمایا گیا کہ اللہ نے کسی انسان کے دو دل نہیں بنایا (الاحزاب ۴) یعنی جب عضو یا قی خلق میں انسان کو دو دل والا نہیں بنایا گیا ہے تو سوچ اور جذبات کے اعتبار سے بھی دو دل والا ہونا اس کے لئے صحیح نہیں ہو سکتا۔

موجودہ دنیا میں چونکہ انسان کو آزادی حاصل ہے اس لئے یہاں کوئی شخص ایسا کر سکتا ہے کہ وہ ایک معاملہ میں ایک طرز پر سوچے اور دوسرے معاملہ میں دوسرے طرز پر سوچے، وہ ایک مجمع میں ایک ڈھنگ پر بولے اور دوسرے مجمع میں دوسرے ڈھنگ پر تقریر کرے۔ وہ جسم کے اعتبار سے ایک دل والا انسان ہونے کے باوجود ذہن اور زبان کے اعتبار سے دو دل والا انسان بن کر رہے۔ بلکہ کئی دل والا انسان بن جائے۔ مگر ایسی ہر صورت خدا کے تخلیقی نقشہ کی خلاف ورزی ہے۔ وہ فطرت کے مقررہ راستہ سے انحراف کرنا ہے۔ موجودہ دارالامتحان میں کوئی شخص ایسا متضاد رویہ اختیار کر کے کامیاب ہو سکتا ہے مگر آخرت کی حقیقی اور معیاری دنیا میں اس قسم کا خلاف فطرت رویہ بالکل بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔ اس قسم کا انداز اختیار کرنے والا آدمی موجودہ دنیا میں خوب کامیاب رہتا ہے۔ وہ ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کے حسب حال بات کرتا ہے۔ وہ جس سے ملتا ہے یا جہاں جاتا ہے، ہر جگہ وہی بات کہتا ہے جو وہاں کے لوگوں کی پسند کے مطابق ہو۔ مگر اس کی ہوشیاری صرف موجودہ دنیا میں کسی کے کام آ سکتی ہے۔ کیونکہ یہ دنیا سچائی کے ظہور کی دنیا نہیں۔ آخرت سچائی کے ظہور کی دنیا ہوگی۔ وہاں حق حق کی صورت میں اور باطل باطل کی صورت میں ظاہر ہو جائے گا۔ وہاں جمیل بن معمر الجحی جیسے ماہرین بالکل بے قیمت ہو جائیں گے۔ وہ ساری مہارت کے باوجود ایسا محسوس کریں گے جیسے ان کے پاس زبان ہی نہیں جس سے وہ بولیں اور ان کے پاس قلم ہی نہیں جس سے وہ کچھ لکھ سکیں۔

اپنے کو تول لو اس سے پہلے کہ تمہیں تولاجائے

حضرت ثابت بن حجاج کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق نے کہا: اپنے آپ کو تول لو قبل اس کے کہ تمہیں تولاجائے۔ اپنا حساب کر لو قبل اس کے کہ تمہارا حساب کیا جائے کیونکہ کل کے حساب کے مقابلہ میں آج اپنا حساب کر لینا زیادہ آسان ہے اور بڑی پیشی کے لئے اپنے کو تیار کر لو (زفوا انفسکم قبل ان تؤذوا وحاسبوا قبل ان تماسبوا فانہ اھون علیکم فی الحساب غداً ان تماسبوا انفسکم وتذنیوا للعرض الاکبر، حلیۃ الاولیاء لابن نعیم جلد ۱)

ایک نے مار کھائی دوسرا بچ گیا

سالم بن ابی جعد کہتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداء کے سامنے سے دو بیل گزرے جو ایک گاڑی میں جتے ہوئے تھے۔ ایک ان میں سے کام پر لگا رہا اور دوسرا رک گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوالدرداء نے کہا: اس میں بھی عبرت ہے۔ یعنی رکنے والے نے ڈنڈا کھایا اور دوسرا بچ گیا (مؤثران علی ابی الدرداء وہما یعملان فقام احدھما و دعت الآخر فقال ابوالدرداء: ان فی ہذا المعتبوا، صفوۃ الصفوۃ جلد ۱)

سوچنا اور عبرت پکڑنا سب سے بڑا عمل ہے

حضرت عون بن عبد اللہ بن عتبہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ام الدرداء سے پوچھا کہ حضرت ابوالدرداء کا اکثر عمل کیا ہوتا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: سوچنا اور عبرت پکڑنا (قبل لام الدرداء ما کان اکثر عمل ابی الدرداء رضی اللہ عنہ قالت التفکر والاعتبار، حلیۃ الاولیاء لابن نعیم جلد ۱)

صحابہ کرام کی عبادت خدا اور آخرت میں غور کرنا تھا

حضرت محمد بن واسع کہتے ہیں کہ حضرت ابوذر کی وفات کے بعد ایک شخص بصرہ سے سوار ہو کر مدینہ آیا اور ان کی اہلیہ ام ذر سے ملا تاکہ حضرت ابوذر کی عبادت کے بارے میں معلوم کرے۔ ام ذر نے کہا: وہ سارے دن تنہا غور و فکر کرتے رہتے تھے (ان رجلاً من البصرۃ ركب الی ام ذر رضی اللہ عنہا بعد وفاة ابی ذر رضی اللہ عنہا یسألھا عن عبادۃ ابی ذر فانھا قال: جئتک لتخبرینی عن عبادۃ ابی ذر رضی اللہ عنہ، قالت: کان النہار اجمع خالیاً تفکر، حلیۃ الاولیاء لابن نعیم جلد ۱)

ہر چیز میں عبرت اور نصیحت ہے

حضرت دارانی نے کہا کہ میں اپنے گھر سے نکلتا ہوں تو جس چیز پر بھی میری نگاہ پڑتی ہے مجھے اس میں خدا کی کوئی نعمت نظر آتی ہے اور میرے لئے کوئی عبرت ہوتی ہے (قال الدارانی: انی لا اخرج من منزلی فہا یقع بصری علی شیء الا رأیت للہ علی فیہ نعمہ ولی فیہ عبرۃ، تفسیر ابن کثیر)

# ایک سفر

جمعیتہ الدعوة الاسلامیہ (یہیہ) کی دوسری عالمی کانفرنس ۱۳- ۱۹ اگست ۱۹۸۲ء کو طرابلس میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں طرابلس کا سفر ہوا۔ ۱۳ اگست کو میں طرابلس پہنچا اور ۳۰ اگست تک وہاں قیام رہا۔ مولانا محمد ہاشم القاسمی بھی اس سفر میں میرے ساتھ تھے۔

جمعیتہ الدعوة الاسلامیہ کے تخیل اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں جو تعارفی کتاب ادارہ کی طرف سے شائع کی گئی ہے، اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

پہلی دعوتی کانفرنس جو طرابلس میں ۱۳ شوال ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۹۷۷ء کو ہوئی، اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ جمعیتہ الدعوة الاسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تاکہ وہ خدا کی طرف اور اس کے سچے دین اسلام کی طرف دعوت دینے کے معاملات کو سنبھالے اور دین اسلام کو آباد دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچائے۔ یہ ایک فرض ہے جو مسلمانوں کے کندھوں پر ان کے بھائیوں کے حق میں ڈالا گیا ہے۔ یہ اسلامی دعوت کی ادائیگی ہے جس کی امت اسلامیہ مکلف ہے جو کہ خیر امت ہے اور لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے تاکہ وہ انسان کی خدمت کرے جو حیرت کے اندھیروں میں گم ہے اور اسلام کا محتاج ہے۔ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانیت کو حیرانگی اور گمراہی سے نکالے اور اس کو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرے اور اس کی مشکلات کو حل کرے اور اس کو اس سعادت سے ہم کنار کرے جس کو دنیا کے تمام نظام فراہم کرنے سے عاجز رہے ہیں (عربی سے ترجمہ)

جمعیتہ الدعوة الاسلامیہ کے موجودہ ذمہ دار (این) دکتور محمد احمد الشریف ہیں۔ اس ادارہ کے مقاصد میں سے خاص مقاصد یہ ہیں — داعی اور استاد تیار کرنا، اسلامی دعوت کے اداروں کو تعاون دینا، قرآن اور دوسری اسلامی کتابیں شائع کرنا۔ جمعیتہ الدعوة الاسلامیہ نے افریقہ، ایشیا، یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں تقریباً ساڑھے تین سو داعی اور اساتذہ بھیجے ہیں۔ ان لوگوں نے مختلف ملکوں میں، ہزاروں آدمیوں کو اسلام میں داخل کیا ہے۔ جمعیتہ الدعوة نے مختلف ممالک میں مسجدیں اور اسلامی مراکز قائم کئے ہیں اور ایک سو سے زیادہ اسلامی اداروں کو گراں قدر امداد فراہم کی ہے، بڑی تعداد میں اسلامی کتابیں چھاپ کر ساری دنیا میں تقسیم کی گئی ہیں۔ وغیرہ

جمعیتہ الدعوة کے تحت ۱۹۷۴ء میں ایک تربیتی کالج قائم کیا گیا جس کا نام کلیۃ الدعوة الاسلامیہ ہے۔

یہ ادارہ طرابلس میں قائم ہے اور اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس ادارہ کا مقصد یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں کو اسلام کے ماضی اور حال سے واقف کرایا جائے۔ اسلام کی فکری عظمت اور اس کی علمی افادیت ان کے ذہن پر بٹھائی جائے۔ ایسے داعی تیار کئے جائیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام کی دعوت کا کام کریں۔ اس کلیہ میں تعلیم کی مدت چار سال ہے اور اس میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے درجہ تک کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ اس کا نصاب کلیہ کے مطبوعہ مفلٹ کے مطابق حرب ذیل مضامین پر مشتمل ہے :

التفسیر و علوم القرآن ، الحدیث و علوم السنہ ، الفقہ الاسلامی ، تاریخ التشریع الاسلامی ،  
التاریخ الاسلامی ، الاستشراق والتبشیر ، حاضر العالم الاسلامی ، علم النفس العام ، علم الاجتماع ،  
الادیان و مقارنتها ، الفرق الاسلامیہ ، التيارات الفكریہ المعاصرہ ، التصوف و تاریخہ ، علم الاخلاق ،  
المحاضرة الاسلامیہ ، الفلسفۃ الاسلامیہ ، علم النفس الاجتماعی ، اللغات الاوروبیہ ، اللغات الشرقیہ

ہندستان اور طرابلس کے درمیان چھ ہزار کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ہندستان میں ”طرابلس“ کا لفظ غالباً سب سے پہلے ۱۹۱۱ء میں عام ہوا جب کہ اٹلی کی ۲۵ سالہ حکومت نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے یہی عوام پر مظالم کئے۔ اس وقت ہندستان کے اخبارات نے مضامین لکھے اور شاعروں نے نظمیں کہیں۔ اسی زمانہ میں اقبال نے اپنی مشہور نظم کہی تھی اس کے دو اشعار یہ تھے :

مگر میں نذر کو اک آگینہ لایا ہوں

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں طرابلس کے شہیدوں کا ہے ہوا اس میں

میں طرابلس ایسے موقع پر پہنچا جب کہ لبنان میں فلسطینی مسلمانوں کے اوپر اسرائیل کے وحشیانہ مظالم (۱۹۸۲) جاری تھے۔ اس کے بعد جس طرح ذلت کے ساتھ فلسطینیوں کو لبنان چھوڑنا پڑا، اس کی چیخ و پکار سے تمام عرب اخبارات بھرے ہوئے نظر آئے۔ اگر مذکورہ تقابل کو دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ملت اسلامیہ نے ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک آگے کی طرف سفر طے نہیں کیا۔ ملت اسلامیہ ستر سال پہلے جس طرح ظالموں کے مقابلہ میں بے بس تھی۔ اسی طرح وہ ستر سال بعد بھی ظالموں کے مقابلہ میں بے بس ہے — جس ملت کے لئے دور اول میں غلبہ مقدر کیا گیا تھا، کیا بعد کے دور میں اس کے لئے مظلومیت اور مغلوبیت مقدر کر دی گئی ہے۔

دہلی سے یسٹیا کے لئے ابھی تک براہ راست ہوائی سروس نہیں ہے۔ ہم نے دہلی سے ایتھنز تک ڈیج ہوائی کمپنی (KLM) کے ذریعہ سفر کیا اور ایتھنز سے طرابلس کے لئے اولپک ایر ویز کے ذریعہ ۔

۱۳ اگست کو ایک دن ایٹھنز (یونان) میں قیام رہا۔ یونان کی زمین پر یہ مختصر قیام بڑا عبرت انگیز تھا۔ اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں دور قدیم کے بڑے بڑے حکماء اور فلاسفر پیدا ہوئے۔ اسپین کے بعد یہ دوسرا مقام ہے جہاں سے اسلام نے ”مغرب“ کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ مگر آج انھیں راستوں سے ”مغرب“ اسلامی دنیا میں داخل ہو رہا ہے۔ بلکہ اس کو اپنے نفوذ کے لئے قدیم روایتی راستوں کی ضرورت نہیں۔ وہ بے شمار نئے راستوں سے اس طرح عالم اسلام میں گھس رہا ہے کہ اس پر قرآن کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں۔۔۔ وہم من کل حدیب یبسلون

۱۳ اگست کو جب کہ ہم طرابلس سے بہت دور ایک غیر ملک (یونان) میں تھے۔ ہوائی اڈہ کی ایک خاتون آئیں اور ہمارا تعارف حاصل کرنے کے بعد ہم کو خوش آمدید کہا۔ ان کو حکومت لیبیا کی طرف سے ٹیکس پر ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ہم سے ملیں اور ہماری مدد کریں۔ چنانچہ وہ ہم کو عام ہوائی مسافروں کی صف سے نکال کر ایک خصوصی جہان خانہ میں لے گئیں۔ یہاں کھانے اور دوسری ضروریات کا اعلیٰ انتظام تھا۔ جب اگلے جہاز کا وقت آیا تو خاتون دوبارہ آئیں اور عام مسافروں سے الگ ایک خصوصی گاڑی پر سوار کر کے ہم کو طرابلس جانے والے جہاز تک پہنچایا۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے آخرت کا معاملہ یاد آگیا۔ جنت میں کسی آدمی کا داخلہ اگرچہ حشر میں حساب کتاب کے بعد ہوگا۔ مگر حدیث میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کا اخروی انجام اس کی موت کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس پر کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جب آدمی کے ابدی انجام کا فیصلہ قیامت کے بعد ہوگا تو قیامت سے پہلے کسی آدمی کے لئے اس کا تجربہ کیسے ممکن ہے۔ مذکورہ واقعہ تمثیلی انداز میں اس کا ایک جواب ہے۔ ہماری میزبانی کا اصل مقام اگرچہ براعظم افریقہ کے ایک ملک (لیبیا) میں تھا۔ مگر چونکہ یہ سرکاری میزبانی تھی اس لئے اس کا آغاز بہت پہلے براعظم یورپ کے ایک ملک (یونان) سے شروع ہو گیا جب کہ ابھی ہم میزبان ملک کی سرحد میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے۔

طرابلس میں ایک روز میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں تھا کہ دروازہ باہر سے مقفل ہو گیا۔ یہ کمرے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ نہ باہر کی آواز اندر آئے اور نہ اندر کی آواز باہر جائے۔ ایسی حالت میں دروازہ کو دوبارہ کھلوانے کے لئے مجھے کافی شور و غل کرنا ہوتا۔ مگر مجھے سادہ طور پر صرف یہ کرنا پڑا کہ میں نے انٹرکام پر نمبر ۱۷ کو ڈائل کیا۔ ادھر سے ہو کی آواز آئی تو میں نے بتایا کہ میں کمرہ نمبر ۱۱۴۸ میں ہوں اور میرا کمرہ باہر سے مقفل ہو گیا ہے۔ چنانچہ ایک منٹ میں ہوٹل کا آدمی آیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ ان کے پاس ماسٹر کی ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ ایک ہی کنجی سے پوری منزل کے تمام دروازے کھول سکتے

**Ladies and Gentlemen**

I am very thankful to you for according me the honour of presiding over this international assembly of Muslim scholars and preachers. May God help us to carry out His will.

First, I congratulate the Govt. of Libya, Dr M.A. Sharief, and other members of the *Jamiat Ad-Dawah Al-Islamia* for affording us the opportunity of having Muslims from all over the world under one roof, discussing matters of Islamic *Dawah*.

The most obvious lesson of this universal gathering of Muslims is that Islamic *Dawah* is the most certain base of unity among Muslims. *Dawah* is the only issue about which there is no controversy among different sects of Muslims; moreover, this is the only field of work where we can enjoy the cooperation of the Muslim rulers of our day. This great conference of Islamic Call is an incontrovertible proof of this.

Let us avail of this opportunity and open a new page of our history, one of unity, of joint effort, and of result-oriented struggle. May Allah bless you and bestow upon you the wisdom which leads to ultimate success and salvation.

Finally, I would request all the learned speakers to observe the time limit (for speech) and in this too, set an example of Islamic discipline.

Now I request Shaikh Dr Mostafa Al-Hamshary to carry on the proceedings.

---

Presidential address delivered by Maulana Wahiduddin Khan  
at the second Islamic Conference, Tripoli 15th August 1982

ہیں۔۔۔۔۔ جہاں لوگوں کے پاس صرف اپنے اپنے تالے کی کنجیاں ہوں وہاں لوگ اکثر یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ کوئی ایسی شاہ کلید بھی ہو سکتی ہے جس کے ذریعہ ان کے اپنے تالے سمیت تمام تالوں کو کھولا جاسکے۔

ہندستان میں ”بائیں چلو“ کا اصول ہے اور لیبیا میں ”دائیں چلو“ کا اصول۔ نئی دہلی کا کوئی آدمی ایسا نہیں کرے گا کہ وہ طرابلس کی سڑک پر ”بائیں چلو“ کے اصول پر اپنی گاڑی دوڑانے لگے۔ اسی طرح طرابلس کا ایک آدمی کبھی ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ نئی دہلی کی سڑک پر ”دائیں چلو“ کے اصول پر عمل کرے اور اپنی گاڑی لے کر دائیں رخ پر دوڑنے لگے۔ سڑکوں کے بارے میں ہر آدمی اس قانون کو جانتا ہے مگر زندگی کے معاملہ میں ہر آدمی اس اصول کو بھول جاتا ہے۔ یہاں ہر آدمی اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ اسے کسی ”خارجی قانون“ کی پابندی کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ذوق کے مطابق خواہ دائیں طرف اپنی زندگی کی گاڑی دوڑائے یا بائیں طرف۔

کانفرنس کا افتتاح ۱۴ اگست کی شام کو ہوا۔ اس کے بعد پانچ روز تک باقاعدہ کارروائی جاری رہی۔ ہر روز کا اجلاس کسی خاص آدمی کی صدارت میں ہوا۔ ایک دن (۱۵ اگست) کی نشست کے لئے راقم الحروف کو صدر جلسہ (یہاں کی اصطلاح میں امین جلسہ) بنایا گیا۔ میں نے اپنی صدارتی تقریر انگریزی میں کی اور اس میں چند باتیں کہیں۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس وقت دنیا بھر کے مسلمان یہاں ایک چھت کے نیچے جمع ہیں۔ ان کو جس چیز نے یکجا کیا ہے وہ اسلامی دعوت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت ایک ایسا عنوان ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتحاد ہو سکتا ہے۔ پھر کیوں ہم ان عنوانات پر زور آزمائی کریں جن میں مسلمان ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بجائے ہم کو دعوت کے مقصد کو لے کر آگے بڑھنا چاہئے جو اتحاد و اتفاق پیدا کرتا ہے اور اتحاد و اتفاق بلاشبہ سب سے بڑی قوت ہے۔

کانفرنس کی کارروائی چھ دن جاری رہی۔ پروگرام کی تفصیل مطبوعہ نقشہ کے مطابق حسب ذیل تھی:

|         |                                    |
|---------|------------------------------------|
| ۱۴ اگست | الافتتاح                           |
| ۱۵ اگست | الدعوة الاسلامیہ فی عالمنا المعاصر |
| ۱۶ اگست | الدعوة الاسلامیہ ومشكلات المسلمین  |
| ۱۷ اگست | قضیۃ الحریۃ فی العالم الاسلامی     |
| ۱۸ اگست | الاسلام وتحدیات العصر              |
| ۱۹ اگست | بیان المؤتمر والتوصیات الختامیہ    |

آخری دن کی کارروائی میں اتفاق رائے سے اسلامی دعوت کا کام انجام دینے کے لئے مختلف ملکوں سے ایک عالمی کونسل (مجلس عالمی للدعوة الاسلامیہ) بنائی گئی جو اس مؤقر عام کے لئے مجلس تنفیذی کے طور پر کام کرے گی۔ اس کونسل میں راقم الحروف کا نام شامل کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس عالمی کونسل کا ہر سال کم از کم ایک اجلاس طرابلس میں ہوا کرے گا۔ اس کے ممبران کی مجموعی تعداد ۳۶ ہے۔

۱۶ اگست ۱۹۸۲ء کو میرا مقالہ تھا۔ میرے مقالہ کے ساتھ عجیب قصہ پیش آیا۔ طرابلس کے سفر سے پہلے مجھے لندن کا سفر کرنا پڑا۔ وہاں سے واپسی کے فوراً بعد طرابلس کے لئے روانگی تھی۔ اس ہنگامی صورت حال کی وجہ سے طرابلس کی کانفرنس کے لئے کوئی مستقل مقالہ تیار کرنے کا موقع نہ تھا۔ لندن کے سفر پر جاتے ہوئے میں نے برادر مر مولانا محسن عثمانی ندوی ایم اے کو اپنی مطبوعہ کتاب الاسلام متحدی دی ادران سے کہا کہ اس سے معلومات لے کر ایک مقالہ تیار کر دیں۔ انھوں نے مقالہ تیار کیا اور وہ ہندستان کے یسبی سفارت خانہ کی معرفت طرابلس پہنچ کر وہاں سائیکلو اسٹائل بھی ہو گیا۔

میں اسی مقالہ کو لے کر طرابلس پہنچا اور ذہن میں یہ تھا کہ اسی کو وہاں کی کانفرنس میں پڑھنا ہے۔ اس درمیان میں ایسا ہوا کہ میں نے ایک امریکی نو مسلم کو ایک دن پہلے یہ مقالہ پڑھنے کے لئے دیا جو عربی زبان اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے پڑھنے کے بعد کہا کہ یہ تو آپ کی کتاب الاسلام متحدی کا خلاصہ ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ تقریباً پانچ سو آدمی جو مقالہ پڑھتے وقت ہال میں موجود ہوں گے ان میں سے بیشتر الاسلام متحدی کو پڑھ چکے ہیں۔ وہ یقینی طور پر محسوس کریں گے کہ وہی پچھلی بات ان کے سامنے دہرا دی گئی ہے۔

یہ خبر میرے لئے بڑی سخت تھی۔ کیونکہ اگلے ہی دن مقالہ پڑھا جانے والا تھا اور درمیان میں صرف ایک رات کا موقع تھا۔ بہر حال میں نے اللہ کے بھروسہ پر ایک نیا فیصلہ کیا۔ میں نے طے کیا کہ میں ایک نیا مقالہ تیار کروں گا۔ میں نے ذمہ داروں سے نیا مقالہ پڑھے جانے کی اجازت لی۔ اس کے بعد ایک مصری نوجوان کو معاونت کے لئے تیار کیا۔ یہ تھے:

محمد سعید مراد۔ ۱۲ شارع سعید۔ متفرع من شارع طومان باہی۔ حلیۃ الزیتون۔ القاہرہ

طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم دونوں فندق باب البحر (طرابلس) کی گیارھویں منزل پر کمرہ نمبر ۱۴۸ میں عشاء کی نماز پڑھ کر بیٹھے۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مقالہ کا مضمون میں اپنی ہندستانی عربی میں کہتا اور سمجھی سمجھی انگریزی میں اس کی تشریح کرتا۔ اس کے بعد محمد سعید مراد مصری اس کو اپنی فصیح عربی میں لکھتے۔ یہ سلسلہ ساری رات جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب فجر کی اذان ہوئی تو ہمارا مقالہ تیار ہو چکا تھا۔ اگلے دن دوپہر بعد کی نشست میں اس کو پڑھنا تھا۔ اس وقت تک سائیکلو اسٹائل ہو کر اس کی کاپیاں بھی تیار ہو گئیں۔

آدھ گھنٹہ کے اس مقالہ کا عنوان تھا ”القرآن فی مواجہۃ التحذیات العصریۃ“ مقالہ پیش کرنے کے بعد جو ملاقاتیں ہوئیں ان سے اندازہ ہوا کہ لوگوں نے اس کو غیر معمولی طور پر پسند کیا۔ کسی نے کہا: واللہ اسلوب ضریح کسی نے کہا: کان ممتاز اجد۔ کسی نے کہا: لقد اعجبنی کثیرا۔ وغیرہ۔ یہ عربی مقالہ اولاً مؤتمر کی طرف سے سائیکلو اسٹائل کرایا گیا تھا۔ اس کے بعد وزیر اطلاعات عبدالرحمن شلقم کی خصوصی ہدایت کے تحت فوری طور پر اس کو پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ مؤتمر میں پڑھے جانے والے مقالات میں راقم الحروف کا مقالہ واحد مقالہ تھا جس کو اس طرح پمفلٹ کی صورت میں چھاپا گیا۔

آدھ گھنٹہ کے مقالہ میں میں نے یہ دکھایا کہ جدید تحدیات دراصل جدید امکانات ہیں۔ اگر ان کو قرآن کی رہنمائی میں استعمال کیا جائے تو وہ ہمارے لئے نیا مستقبل پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ آخری پیراگراف یہ تھا:

”رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں بظاہر اسلام کو العدو القوی سے معاملہ پیش آیا۔ مگر اس العدو القوی کے اندر حقیقتہً المؤمن القوی کے امکانات چھپے ہوئے تھے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں اگرچہ ہم کو سخت ترین حالات کا سامنا ہے مگر یہ حالات اسلام کے لئے زینے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو لے کر اٹھ جائیں تو تاریخ دوبارہ ثابت کرے گی کہ یہ ساتویں صدی ہجری کی مانند گویا ایک تازہ تلواریں جو صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ بالآخر خدا کے دین کی خدمت و حمایت کے لئے وقف ہو جائے۔“

ایک صاحب امریکہ سے آئے تھے۔ عربی اور انگریزی دونوں زبانیں یکساں روانی کے ساتھ بولتے تھے۔ کھانے کی میز پر ان کا ساتھ ہو گیا۔ بات چیت کے دوران انھوں نے میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا ”وجید الدین“ انھوں نے کہا ”وجید الدین خان“ میں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد وہ بڑے زور کے ساتھ لپٹ گئے۔ وہ میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح کا واقعہ اکثر لوگوں کے ساتھ پیش آیا۔ عربی کتابیں، خاص طور پر الاسلام یحیدی، بار بار چھپ کر تقریباً پوری مسلم دنیا میں پھیلی ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر اس کو پڑھ چکا ہے۔ یہاں اگرچہ دنیا کے مختلف حصوں کے لوگ ہیں تقریباً سارے ہی لوگ الاسلام یحیدی کو پڑھے ہوئے نظر آئے۔ ایسے لوگ بھی ملے جنھوں نے کہا کہ الاسلام یحیدی ابھی میں نے پڑھی نہیں ہے مگر اس کا نام کافی سنا ہے اور پڑھنے کا اشتیاق ہے۔

مزید معلوم ہوا کہ الاسلام یحیدی (مذہب اور جدید جیلنج) کا ترجمہ عربی کے علاوہ اور کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مثلاً یوگوسلاویہ کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک ماہوار رسالہ (Edukata Islame) نکالتے ہیں۔ یہ رسالہ یوگوسلاویہ کی البانوی زبان میں ہے۔ انھوں نے اس یوگوسلاوی زبان میں الاسلام یحیدی

کا ترجمہ کیا ہے۔ فی الحال اس کو انھوں نے اپنے رسالہ کے نمبر کے طور پر شائع کیا ہے اور آئندہ کتابی صورت میں چھاپنے والے ہیں۔ ان کا نام وپتہ یہ ہے :

Mr Sherif Ahmad, direktor medrese Alauddin  
P. F. 89, Pristina, Yugoslavia

اس طرح ہماری معلومات کے مطابق یہ کتاب اردو کے علاوہ عربی، ترکی، فرانسیسی اور یوگوسلاوی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔

الاسلام یچدی عرب دنیا میں اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر تعلیم یافتہ آدمی اس سے باخبر ہے اور اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی سے پوچھا گیا کہ آپ نے الاسلام یچدی پڑھی ہے، اس کا جواب یہ ہوتا تھا: عددہ مرات (کئی بار)

ہماری معلومات کے مطابق، الاسلام یچدی اب تک پانچ عرب ملکوں کی جامعات میں باقاعدہ طور پر داخل نصاب ہو چکی ہے۔ ————— قاہرہ، طرابلس، قطر، خرطوم اور تونس۔ یہاں آنے والوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ کئی عرب یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اساتذہ مستقل طور پر اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اس کے مضامین کو اپنے لکچروں میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر جہاں تک راقم الحروف کا علم ہے، ہندوستان اور پاکستان کی کسی بھی درس گاہ کے نصاب میں اب تک وہ داخل نہ کی جاسکی۔ ہمارے قارئین اور ہمارے مدارس کے ذمہ دار یہ اعلان تو بار بار کرتے رہتے ہیں کہ ”معقولات اور علم کلام پر جدید انداز میں کتاب لکھنے کی ضرورت ہے“ مگر جب ایسی کتاب لکھ کر شائع کر دی جائے تو ان کے اندر یہ جذبہ نہیں ابھرتا کہ اس کو اپنائیں اور عملاً اس کو استعمال کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ہر آدمی صرف کہنے کا کریڈٹ لینا چاہتا ہے، عمل کا کریڈٹ لینے کا شوق کسی کے اندر نہیں۔

طرابلس میں الاسلام یچدی سے متعلق ایک عجیب کہانی معلوم ہوئی۔ طرابلس میں محمد سلیمان القائد اور علی مختار البجیدی ہمارے دعوتی مشن سے بہت متاثر ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں وہ ڈاکٹر عبداللہ الھونی (رئیس قسم اللغة العربیة، کلیۃ التربیۃ، جامعہ طرابلس) سے ملے اور ان سے کہا کہ اسلامی مرکز کے لئے آپ تعاون دیجئے۔ وہ مذکورہ لیپی نوجوانوں کے قریبی ملاقاتی تھے۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم میں تو ایک غریب آدمی ہوں (واللہ انا مفلس)

عبداللہ الھونی کے پاس واقعہً مال نہ تھا۔ تاہم وہ ایک شریف آدمی تھے۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹے تو ان کے دل نے انھیں ملامت کی کہ تمہارا دوست تم سے ایک نیک کام میں مدد لینے کے لئے آیا اور

تم اس کی کچھ مدد نہ کر سکے۔ یہ احساس ان پر اس قدر غالب آیا کہ وہ رات کو ٹھیک سے سو نہ سکے۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ان کے احتساب خویش نے ان کے سامنے ایک نیا وسیع تر دروازہ کھول دیا۔ وہ "الاسلام یחדی" کو پڑھ رہے ہوئے تھے اور اس کی اہمیت کے معترف تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگرچہ میرے پاس مال نہیں ہے اور مال کے ذریعے میں اس دینی مشن کی مدد نہیں کر سکتا۔ مگر میں ایک تعلیمی ادارہ کا صدر ہوں اور میں ایسا کر سکتا ہوں کہ الاسلام یחדی کو اپنے یہاں تعلیمی نصاب میں داخل کر دوں۔

اگلی صبح کو وہ خود مذکورہ لیوی نوجوان کے گھر پہنچے اور اس نے کہا کہ میں نے تمہارے مشن کی مدد کے لئے ایک اور راستہ پالیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ میں نے تمہارے مشن کے تحت شائع شدہ کتاب (الاسلام یחדی) کو یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کر دیا ہے۔ اسی وقت انھوں نے کتاب کے پانچ ہزار نسخوں کا آرڈر لکھ محمد سلیمان القائد کے حوالے کیا اور کہا کہ اس کی فراہمی کا فوراً انتظام کریں۔ چنانچہ کتاب بہت جلد قاہرہ سے منگالی گئی۔

اس کے بعد اگلے چند سالوں میں مزید کتابیں منگائی گئیں۔ اندازہ ہے کہ اس کے بعد مجموعی طور پر تقریباً پچاس ہزار کتابیں لیبیا میں پہنچیں۔ اس کی قیمت مصری سکے میں ۵۰ قرش تھی جو لیبیا میں بمشکل ۵۰ پیسہ کے بقدر ہے۔ چنانچہ طلباء اور غیر طلباء نے کثرت سے خریدا۔ لیبیا اگرچہ رقبہ کے اعتبار سے بڑا ملک ہے۔ مگر اس کی آبادی بہت تھوڑی ہے۔ چنانچہ چند سالوں کے اندر ایسا ہوا کہ الاسلام یחדی لیبیا کے تقریباً ہر پڑھ لکھے آدمی تک پہنچ گئی۔

لیبیا نیز دوسرے ملکوں کے کئی صحافی حضرات نے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات میں دو سوال بہت مشترک ہوتے تھے۔ ایک یہ کہ آپ نے الاسلام یחדی کے بعد اور کیا تحریری کام کئے ہیں۔ میں نے بتایا کہ اس کے بعد کافی تحریری کام ہو چکا ہے مگر عربی میں ان کے ترجمہ اور اشاعت کا کام ابھی باقی ہے۔ دوسرا سوال جو تفتیشی ہر اخبار یا رسالہ والے نے کیا وہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو مشکلات و مسائل درپیش ہیں ان کا آپ کے نزدیک کیا حل ہے۔ میں نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ وہ یہ کہ تمام مسائل کا ایک ہی یقینی حل دعوت الی اللہ ہے۔ دوسرا کوئی حل نہ اب تک کامیاب ہوا ہے اور نہ آئندہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

۲۳ اگست کو طرابلس کے ٹیلی وژن پر میرا ایک انٹرویو نشر کیا گیا۔ اس طرح کا انٹرویو عام طور پر ۱۵ منٹ کا ہوتا ہے مگر میرا انٹرویو خاص طور پر ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ سوالات زیادہ تر دو چیزوں سے متعلق تھے۔ ایک یہ کہ آپ کے مرکز اسلامی کے تحت کیا کیا کام ہو رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جدید تحدیات کے مقابلہ میں آپ کے نزدیک اسلام کا موقف کیا ہونا چاہئے۔

چودہ منزلہ فندق باب البحر کی بالکنی پر کھڑے ہو کر طرابلس کے شہر پر نظر ڈالیں تو وہ خشک عمارتوں کا ایک پتھریلا جنگل معلوم ہوتا ہے۔ نئی دہلی جیسے سبزہ اور درخت کا یہاں کوئی تصور نہیں۔ ہوٹل میں چاروں طرف کثرت سے ہرے بھرے درخت اور پودے نظر آئے۔ ہم سمجھے کہ یہ ہمارے ملک کی طرح واقعی درخت اور پودے ہیں۔ مگر قریب جا کر گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کیا تو وہ سب پلاسٹک کے بنے ہوئے تھے۔ مگر ڈنٹھل اور پتی اور پھول، ہر چیز میں اتنی کامل مشابہت تھی کہ دور سے کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ پلاسٹک کے بنے ہوئے ہیں۔ ————— صحرائی ملکوں میں سبزہ کی کمی نے پلاسٹک انڈسٹری کے لئے تجارت کا ایک نیا میدان کھول دیا ہے۔

ہندستان کے تقریباً پچاس ہزار افراد یسویا میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ جو طرابلس میں رہتے ہیں ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں، پردیس میں اپنے ہم وطنوں سے ملنا ہمیشہ بہت خوشی کا باعث ہوتا ہے، جن سے میری ملاقاتیں ہوئیں وہ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کے ساتھ چند شام گزری جو بہت دن تک یاد رہے گی۔ ان کے ایک اجتماع میں تقریر کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اسلام کے دعوتی پہلو پر اپنے خیالات پیش کئے۔

کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو مختلف تحفے دئے گئے۔ ان میں سب سے زیادہ کارآمد چیز ایک جانماز تھا۔ اس جانماز میں ایک خاص قسم کا قطب نما چپکایا ہوا تھا جس کا نام کاشف الالاتجاہات (Direction Finder) رکھا گیا ہے۔ یہ قطب نما دنیا کے کسی بھی مقام پر قبلہ کا رخ بتاتا ہے۔ اس میں گھڑی کی طرح چالیس اعداد چاروں طرف گولائی میں لکھے ہوئے ہیں اور سامنے ایک مینار بنا ہوا ہے۔ ہر عدد دنیا کے کسی خاص شہر کو بتاتا ہے۔ آپ جہاں کہیں ہوں، گانڈیک میں اس مقام کا عدد دیکھیں اور پھر جانماز کو بچھا کر گھمائیں۔ قطب نما کی سوئی جب مطلوبہ نمبر پر ٹھہر جائے تو اس وقت مینار کا رخ جس جانب ہو گا وہی اس مقام پر قبلہ کا رخ ہو گا۔

طرابلس کی کانفرنس میں دنیا کے تمام حصوں کے لوگ ساڑھے چار سو کی تعداد میں آئے۔ مختلف ممالک سے تقریباً ۵۰ تنظیموں اور اداروں کی نمائندگی یہاں موجود تھی۔ دعوت دین اور احیاء اسلام کے عنوانات پر اس طرح کے اجتماعات مختلف مسلم ملکوں میں کثرت سے کئے جا رہے ہیں۔ سعودی عرب خاص طور پر اس معاملہ میں کافی آگے ہے۔ وہ ساری دنیا میں بڑے پیمانہ پر اسلام کی خدمت کرنے والوں کی مدد کر رہا ہے۔ موجودہ مسلم حکمران اگرچہ سیاسی اسلام کا غرہ لگانے والوں کو براہداشت نہیں کرتے۔ مگر دعوتی اسلام کی کوششوں کو وہ ہر طرح کا تعاون دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ملے ہوئے مواقع کو استعمال کیا جائے نہ یہ کہ ہم اپنی جدوجہد کو اس میدان سے شروع کرنا چاہیں جو ابھی ہم کو حاصل نہیں ہوا۔

۲۹ اگست کو راقم الحروف کے اعزاز میں فندق باب المدینہ میں ایک عشاءِیہ دیا گیا۔ اس عشاءِیہ میں وزیر اور سفراء شریک تھے، طرابلس میں ہندوستان کے سفیر مسٹر ارجن اسرانی نے بھی شرکت کی۔ اس قسم کی تقریب شریکار موتمر میں راقم الحروف کے سوا اور کسی کے لئے منعقد نہیں کی گئی۔ دوسرے معززین کے علاوہ ڈاکٹر طاہر محمد الشوبیدی (الامین العام للہیئۃ المشتركة لتاسیس المراكز الثقافیه الاسلامیہ) بھی اس موقع پر موجود تھے۔

طرابلس کا سوق الجمع (سپر بازار) دیکھا۔ اس طرح کے یہاں چار بازار ہیں، نئی دہلی کے سپر بازار کے مقابلہ میں یہاں کے سوق الجمع کی عمارت کافی زیادہ شاندار تھی۔ کئی منزلہ عمارت میں خود کار سیڑھیوں کا نہایت عمدہ انتظام تھا۔ حساب کتاب کرنے کے لئے جدید طرز کی درآمد شدہ مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ تاہم خریداری اور سامان کے اعتبار سے وہ نئی دہلی کے سپر بازار سے کم نظر آیا، اس فرق کے ساتھ کہ دہلی میں تمام سامان ملکی ہوتا ہے اور یہاں تمام سامان باہر سے درآمد کیا ہوا۔

طرابلس کا محف (میوزیم) کافی بڑا ہے۔ مگر وہ ترکوں کے ایک قدیم قلعہ میں قائم کیا گیا ہے اس لئے عمارتی اعتبار سے اس میں وہ خوبیاں نہیں ہیں جو اس عمارت میں ہوتی ہیں جو خاص طور پر میوزیم کے مقصد سے بنائی گئی ہو۔ مثال کے طور پر لکھنؤ کا میوزیم مقابلہ کافی چھوٹا ہونے کے باوجود عمارتی اعتبار سے طرابلس کے میوزیم سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

ایک ہندوستانی عالم کے ساتھ عرب دنیا میں بعض اوقات یہ صورت حال پیش آتی ہے کہ وہ بظاہر عربی بولتا ہے مگر عرب اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ عربی لفظ کو اس کے اردو مفہوم میں استعمال کرتا ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے بہت سے الفاظ اردو زبان میں رائج ہیں۔ اس لحاظ سے اردو دانی کو عربی دانی کے لئے کارآمد ہونا چاہئے۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی کے اکثر الفاظ کے معنی اردو میں آکر بدل گئے ہیں۔

مثلاً اردو میں جس چیز کو ہم انقلاب کہتے ہیں، اس کے لئے عربی میں ثورہ کا لفظ ہے۔ عربی زبان میں ثورہ کے معنی ریوولیوشن کے ہیں اس کے مقابلہ میں انقلاب کا لفظ اس مفہوم کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کو انگریزی میں (Coup) کہتے ہیں۔ ہندوستان کے ایک مصنف نے اپنی کتاب کا نام الاقدار الاسلامیہ رکھا ہے۔ اس سے ان کی مراد اسلامک ویلوز ہے۔ مگر ویلو (Value) کے لئے عربی میں قیمت کا لفظ استعمال ہوتا ہے نہ کہ قدر کا۔ اگرچہ قیمت اور قدر دونوں ہی عربی الفاظ ہیں۔ تاہم عربی میں اس کو القیم الاسلامیہ کہیں گے نہ کہ الاقدار الاسلامیہ۔ وہ چیز جس کو اردو میں استحصال کہا جاتا ہے اس کے لئے عربی میں استغلال کا

لفظ استعمال ہوتا ہے، وغیرہ۔

اس سلسلہ میں دوسری مشکل تلفظ کی ہے۔ مثلاً موجودہ عرب اکثر ق کا تلفظ گ سے کرتے ہیں۔ یعنی وہ اقول لٹ (میں آپ سے کہتا ہوں) کو اگل لٹ بولیں گے۔ اسی طرح مثلاً وہ الاستقلال (آزادی) کو اس طرح بولتے ہیں کہ وہ الاستقلال سنائی دیتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسی صورت پیش آتی ہے کہ ہندوستان کا ایک آدمی کسی لفظ کے معنی جانتے ہوئے عربوں کی گفتگو کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ کبھی لفظ کے دہرے مفہوم کی وجہ سے اور کبھی تلفظ کے فرق کی وجہ سے۔ اردو داں مسلمانوں کی انفرادیت پسندی کی یہ عجیب قیمت ہے جو ان کو خود مسلم دنیا میں دینی پڑتی ہے۔

۲۷ اگست کو لیبیا میں ہندوستان کے سفیر مسٹر ارجن اسرانی سے ملاقات ہوئی۔ نہایت ذہین اور بااخلاق آدمی ہیں۔ بہت شریفانہ طور پر ملے اور اس کے بعد مزید تفصیلی ملاقات کی غرض سے ۲۹ اگست کو باصرار اپنے گھر پر کھانے کی دعوت کی۔ کھانے کی میز پر سفیر صاحب کے ساتھ جناب عبدالخالق دہلوی بھی تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک دل چسپ اور مفید گفتگو رہی۔ سفیر صاحب نے اسلامیات کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں نے چند پمفلٹ ان کی خدمت میں پیش کئے۔

اس سفر میں میری ملاقات ایک تعلیم یافتہ عرب سے ہوئی۔ وہ ایک ملک میں اچھے عہدہ پر ہیں۔ ان کو میں جانتا تھا۔ مگر مجھ کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ہمارے مشن سے کس حد تک قریب ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میری عربی کتابیں انھوں نے بار بار پڑھی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اردو کتابوں اور الر سالہ کے بہت سے مضامین کو ہندوستانی یا پاکستانی عربی دانوں کے ذریعہ ترجمہ کرا کر سمجھا ہے۔ اب وہ ہمارے مشن کو پوری طرح پاگئے ہیں اور صد فی صد اس سے متفق ہیں۔

مذکورہ عرب بزرگ نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے ملک میں لوگوں کا معاملہ آپ کے ساتھ کیا ہے۔ میں نے کچھ تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ ایک طبقہ ہمارا سخت مخالف ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس پر تل گیا ہے کہ ہماری جڑ اکھاڑ کر اس مشن کا خاتمہ کر دے۔ یہ لوگ ہمارے خلافت جھوٹے مقدمات قائم کر رہے ہیں۔ ہماری معاشیات کو برباد کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ہم کو اتنا زیادہ پریشان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم تنگ آکر اس مشن کو چھوڑ دیں۔

یہ سن کر عرب بزرگ بولے — آپ کا یہ اسلامی مشن بالآخر ایک تاریخ بننے والا ہے۔ پھر آئندہ بننے والی تاریخ میں یہ لوگ اپنا نام آخر کس خانہ میں لکھوانا چاہتے ہیں۔

## دعا

دعا کا تصور عام لوگوں کے ذہن میں تقریباً وہی ہے جو عابلیں کے یہاں پر اسرار کلمات کا ہوتا ہے۔ عامل یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں الفاظ کسی خاص ترتیب یا خاص تعداد میں زبان سے ادا کر دے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ فلاں صورت میں برآمد ہوگا۔ اسی طرح لوگوں کا خیال ہے کہ دعا الفاظ کے کسی مجموعہ کا نام ہے جس میں خاص تاثیرات چھپی ہوئی ہیں۔ اگر آدمی دعا کے ان الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر دے تو اس کے نتیجہ میں وہ تمام تاثیرات لازماً ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گی۔

مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی خاص قسم کے لفظی مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جو احساس احتیاج کے تحت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہیں اور پھر لفظوں کی صورت میں اُصّل جاتی ہیں۔

قرآن میں بہت سے انبیاء اور صلحاء کی دعائیں مذکور ہیں (مثلاً حضرت موسیٰ کی دعا، اصحاب کہف کی دعا، امراۃ فرعون کی دعا) یہ ثابت ہے کہ ان لوگوں کی زبان عربی نہیں تھی۔ انبیاء کے متعلق قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ وہ مختلف علاقوں میں آئے اور وہ جہاں آئے وہیں کی مقامی زبان میں کلام کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی دعا ان کی اپنی مادری زبان (مقامی زبان) میں ہوتی تھی نہ کہ عربی زبان میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں ان کی دعا صرف معنماً مذکور ہے نہ کہ لفظاً۔

اسی طرح حدیث میں بہت سے انبیاء کی دعائیں مذکور ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی یہ دعا جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد کو سکھائی:

اللّٰهُمَّ فَارِجَ الْهَمِّ وَكَاشِفَ الْغَمِّ وَمُجِيبَ دَعْوَةِ الْمُضْطَرِّينَ رَحْمَنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ رَحِمَهُمَا أَنْتَ تَرْحَمُنِي فَارْحَمْنِي بِرَحْمَةٍ تُغْنِنِي بِهَا عَنْ رَحْمَةِ مَنْ سِوَاكَ (رواہ البزار والحاکم والاصبہانی)

اے غم کو دور کرنے والے اور مجبور کی پکار کو سننے والے، دنیا اور آخرت کے رحمان اور رحیم، تو ہی مجھ پر رحم کرتا ہے۔ مجھ پر ایسی رحمت کر جس کے بعد میں تیرے سوا دوسرے کی رحمت سے بے نیاز ہو جاؤں۔

ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کی زبان عربی نہیں تھی اس لئے یقینی طور پر یہ دعا انھوں نے اس زبان میں بتائی جو ان کی اور حواریوں کی پیدائشی زبان تھی۔ حدیث میں یہ دعا اگرچہ عربی زبان میں نقل ہوئی ہے مگر یہ نقل بالمعنی ہے نہ کہ نقل بالالفاظ۔

# اسباق سیرت

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ تمھارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے ،  
لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر و ذکر ہر اس شخص کے لئے جو اللہ کا اور آخرت کے دن  
اللہ کثیرا (الاحزاب ۲۱) کا امیدوار ہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہر انسان کے لئے مکمل نمونہ  
ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ یہ نمونہ صرف اس شخص کے لئے ہے جو اللہ کو بہت زیادہ یاد  
کرنے والا ہو، جو اللہ اور آخرت کا امیدوار بن چکا ہو۔

گویا رسول کی زندگی کا نمونہ، پوری طرح موجود ہونے کے باوجود، اپنے آپ ہر آدمی کے لئے  
نمونہ نہیں بن جائے گا۔ وہ صرف اس بندہ خدا کے لئے نمونہ بنے گا جس نے اللہ کو اتنی گہرائی کے ساتھ  
پایا ہو کہ وہ اس کی یادوں میں سما جائے۔ اللہ جس کی تمناؤں کا سرمایہ بن چکا ہو۔ جس کا حال یہ ہو  
کہ وہ اللہ کے عذاب سے ڈرنے لگے اور آخرت کا انعام جس کی نظر میں اتنا اہم بن جائے کہ وہ  
دل و جان سے اس کا آرزو مند ہو۔

رسول کے اسوۃ حسنہ کو پانے کے لئے یہ شرط کیوں لگائی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حقیقت  
کے ادراک کے لئے اس کے بارے میں سنجیدہ ہونا شرط لازم ہے۔ خدا اور آخرت سے مذکورہ  
قسم کا تعلق ہونا آدمی کو خدا اور آخرت کی باتوں میں سنجیدہ بناتا ہے۔ یہی سنجیدگی اس بات کی  
ضمانت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۃ کو صحیح نظر سے دیکھے اور اس سے مطلوبہ سبق  
لے سکے۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ایک مثال لیجئے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

من قتل دون مالہ فهو شہید۔ ومن قتل جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید  
دون دمہ فهو شہید۔ ومن قتل دون دینہ ہے۔ جو شخص اپنے خون کی حفاظت میں مارا جائے

فہو شہید۔ ومن قتل دون اہلہ فہو شہید وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے گھروالوں کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے، یہ حدیث ”لڑنے“ کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ”مارے جانے“ کی صورت میں مومن کے انجام کو بتانے سے متعلق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ نہیں ہے کہ جب بھی کہیں کوئی مال یا خون یا دین یا اہل و عیال کا مسئلہ پیش آئے، تم فوراً لڑ جاؤ، خواہ اس کے نتیجہ میں یہی کیوں نہ ہو کہ تم قتل کر دے جاؤ۔ بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ مذکورہ اسباب سے کوئی شخص مومن کو قتل کر دے تو اس کا قتل قتل نہیں بلکہ شہادت ہو گا۔ گویا یہ حدیث اصلاً لڑائی پر اکسانے کے لئے نہیں ہے بلکہ قتل کر دے جانے کی صورت میں شہادت کا درجہ پانے سے متعلق ہے۔

اب جو شخص دین کے بارے میں سنجیدہ نہ ہو، جس کو اپنے ذاتی ذوق کے لئے رسول اللہ کا جواز مطلوب ہو وہ بس حدیث کے الفاظ کو لے لے گا اور اپنے نفسانی جھگڑوں اور قومی لڑائیوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس کو بطور دلیل پیش کرے گا۔ وہ کہے گا کہ اسلام آدمی کو مردانگی کی تعلیم دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اپنے دین و ایمان، جان و مال، زمین و جائداد، بیوی بچوں اور خوش و اقارب کی حفاظت کے لئے لڑ جاؤ۔ اگر تم جیت گئے تو تم نے اپنا مقصد پالیا۔ اگر تم ہار گئے تو تم شہید ہوئے۔ اور شہادت وہ رتبہ بلند ہے جو خوش قسمت انسانوں ہی کو ملتا ہے۔

مگر جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہو وہ اس کو نہایت سنجیدہ ہو کر دیکھے گا۔ اس کی سنجیدگی اس کو اس سوال تک پہنچائے گی کہ جب مال اور خون اور دین اور خاندان کے دفاع میں لڑنا مزنا مطلوب ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس قسم کی برعکس مثالیں کیوں ہیں کہ آپ بہت سے مواقع پر صریح ظلم کے باوجود صبر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

۱۔ مثال کے طور پر ابن ہشام نے ابو عثمان التہمدی کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے:

|                                           |                                                  |
|-------------------------------------------|--------------------------------------------------|
| بلغنی ان صہیباً حین اراد الہجرت قال لہ    | مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت صہیب نے جب مکہ    |
| کفار قدیش ایتینا صلوا کا حقیر افکثر ما لک | سے ہجرت کا ارادہ کیا تو کفار قریش نے ان سے کہا   |
| عندنا وبلغت الذی بلغت ثم تری ان تخرج      | کہ تم ہمارے یہاں آئے تو بالکل غریب تھے۔ پھر      |
| بمالک و نفسک، واللہ لا یكون ذلک۔ فقتال    | تمہارے پاس یہاں بہت مال ہو گیا اور تم اس درجہ کو |

لهم صهييب ارايتم ان جعلت لكم مالى اتخلون  
سبيلى - قالوا نعم - قال فاني جعلت لكم مالى -  
قال فبلغ ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم  
فقال ربح صهييب ربح صهييب -  
(سيرة النبی لابن ہشام، الجزر الثانی، صفحہ ۸۹)

پہنچے جس درجہ میں تم اب ہو۔ تم چاہتے ہو کہ اپنے  
جان و مال کے ساتھ یہاں سے چلے جاؤ تو خدا کی  
قسم ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ حضرت صہیب نے ان سے  
کہا، اگر میں اپنا مال تمہارے حوالے کر دوں تو تم  
مجھ کو جانے دو گے۔ انھوں نے کہا، ہاں۔ حضرت  
صہیب نے کہا پھر میں نے اپنا مال تمہارے حوالے  
کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: صہیب کی تجارت  
کامیاب رہی، صہیب کی تجارت کامیاب رہی۔

مذکورہ حدیث میں مال کے مقابلہ میں لڑکر جان دینا اگر مطلق معنوں میں ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کو چاہئے تھا کہ حضرت صہیب کو ناکامی کا الزام دیں نہ کہ انھیں کامیابی کا کریڈٹ عطا فرمائیں۔  
۲۔ ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے ارادہ سے مدینہ سے روانہ  
ہوئے۔ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش نے آگے بڑھ کر روکا۔ اس موقع پر فریقین کے  
درمیان صلح کی گفت و شنید ہو رہی تھی کہ وہاں ابو جندل بن سہیل آگئے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔  
اس کی وجہ سے مکہ والے ان کو سخت تکلیفیں دے رہے تھے اور ان کے پیروں میں لوہے کی زنجیریں ڈال  
دی تھیں۔ انھوں نے جب سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب حدیبیہ میں ہیں  
تو وہ کسی طرح بھاگ کر مکہ سے حدیبیہ پہنچے۔ اس وقت بھی ان کے پیروں میں بیڑیاں تھیں اور ان  
کا جسم خون آلود ہو رہا تھا۔ ان کو دیکھ کر قریش کے سردار سہیل بن عمرو (ابو جندل کے والد) نے  
کہا کہ ابو جندل کو ہمیں واپس کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے بہت  
چاہا کہ انھیں دوبارہ مکہ نہ بھیجا جائے۔ مگر سہیل بن عمرو نے کہا کہ اگر آپ نے ابو جندل کو ہمارے  
حوالے نہ کیا تو ہم آپ سے کسی طرح کی کوئی صلح نہیں کریں گے۔

یہ بڑا جذباتی لمحہ تھا۔ ابو جندل بیڑیوں میں خون آلود سامنے کھڑے تھے۔ انھوں نے کہا:  
اے مسلمانو، کیا میں مشرکین کی طرف لوٹا دیا جاؤں گا، حالانکہ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ کیا تم  
لوگ دیکھتے نہیں کہ ان لوگوں نے مجھے کس قدر عذاب پہنچایا ہے۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے ان کو مکہ کی طرف لوٹا دیا اور ان سے کہا:

یا ابا جندل اصابوا حسب فان الله  
 جاعل لك دمن معك من المستضعفين  
 اے ابو جندل، صبر کرو، اللہ تمہارے لئے  
 اور دوسرے کمزور مسلمانوں کے لئے گنجائش  
 فرما دے گا۔

(سیرۃ النبی لابن ہشام - الجزر الثالث، صفحہ ۳۶۷)

مذکورہ حدیث میں لڑنا اور شہید ہو جانا اگر مطلق معنوں میں ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 وسلم اس موقع پر حضرت ابو جندل کو صبر و رضا کی نصیحت نہ فرماتے۔ بلکہ انھیں شہادت کا راستہ  
 بتاتے اور خود بھی اپنے اصحاب سمیت قریش سے لڑ جاتے۔

۳۔ اسی حدیث کا واقعہ ہے کہ قریش نے آپ کو روکا اور کہا کہ ہم اس سال آپ کو عمرہ کے  
 لئے مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ اس پر راضی ہو کر واپس مدینہ چلے آئے۔ اور عمرہ  
 کے لئے مکہ جانے پر اصرار نہیں کیا۔ حالانکہ یہ خالص دینی معاملہ تھا اور آپ خدائی بشارت کی بنیاد  
 پر اپنے اصحاب کو لے کر زیارت حرم کے لئے جا رہے تھے۔ اگر مذکورہ حدیث میں دین کے لئے لڑ کر شہید ہونا مطلق  
 معنوں میں ہو تو آپ کو چاہئے تھا کہ اسی سال عمرہ کرنے کے لئے اصرار کریں، خواہ اس کے نتیجہ میں  
 عمرہ ملے یا شہادت۔

۴۔ مکہ میں عمار بن یاسر اور ان کے والدین بنو مخزوم کے غلام تھے۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی  
 اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر اسلام میں داخل ہو گئے۔ بنو مخزوم کو ان کا اسلام لانا سخت ناپسند تھا۔ چنانچہ  
 وہ ان کو عین دوپہر کے وقت صحرا میں لے جاتے اور تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر انھیں سخت عذاب  
 دیتے۔ حتیٰ کہ عمار کی والدہ کو انھوں نے قتل کر دیا۔ ابن ہشام اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فیم یہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقول فیم بالغنی: صبرا آل یاسر  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے  
 گزرتے اور جیسا کہ مجھے روایت پہنچی ہے ان  
 سے کہتے: اے خاندان یاسر، صبر کرو، تمہارے

موعِدکم الجنة (الجزر الاول صفحہ ۳۴۲)

لئے جنت کا وعدہ ہے۔

مذکورہ حدیث اگر مطلق معنوں میں ہو تو ایسا کہنا، نعوذ باللہ، نبردلی کی تعلیم دینا ہو گا۔  
 پھر تو آپ کو آل یاسر سے کہنا چاہئے تھا کہ تم لوگ لڑ کر شہید ہو جاؤ اور خود بھی اس مقدس جنگ  
 میں ان کے ساتھ شریک ہو جاتے۔ خواہ آل یاسر کو بچا سکیں یا اسی راہ میں شہادت کا  
 درجہ حاصل کر لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسوۂ رسول ان چیزوں میں سے ہے جن کی ایک سے زیادہ تعبیر ممکن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسوۂ رسول کے معاملہ میں آدمی ہمیشہ صحیح تعبیر اور غلط تعبیر کے درمیان رہتا ہے۔ اور جو چیز کسی کو غلط تعبیر سے بچاتی ہے وہ صرف ایک ہے۔ یہ کہ خوف خدا نے آدمی کو حقیقت پسندی کی اس سطح پر پہنچا رکھا ہو جس کو سنجیدگی کہا جاتا ہے۔

آدمی اگر فی الواقع سنجیدہ ہو تو اس کی سنجیدگی اس کو اسوۂ رسول کے بارے میں مذکورہ سوالات سے دوچار کرے گی۔ اس کو چونکہ صرف مفید مطلب بات نہیں لینا تھی بلکہ یہ معلوم کرنا تھا کہ حقیقی طور پر اسوۂ نبوت کیا ہے۔ اس کا یہ ذہن اس کو غلط تعبیر سے بچائے گا۔ وہ بے آمیز ذہن کے تحت اس مسئلہ پر غور کرے گا اور خدا کی توفیق سے بات کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ اب اس کو معلوم ہو گا کہ اس کا راز ہے۔۔۔۔۔ بڑے فائدہ کی خاطر چھوٹے نقصان کو برداشت کرنا۔

اہل ایمان کے لئے سب سے اہم چیز دعوتی مصلحت ہے نہ کہ شخصی مصلحت۔ اگر دعوتی مصلحت اور شخصی مصلحت میں ٹکراؤ ہو تو شخصی مصلحت کو قربان کر کے دعوتی مصلحت کو حاصل کیا جائے گا۔ مذکورہ واقعات میں رسول کی طرف سے صبر کی تلقین کی وجہ یہی دعوتی مصلحت ہے۔ دعوتی کام کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لئے خدا کے رسول نے جان، مال اور خاندان کی قربانیاں برداشت کیں۔ حتیٰ کہ دشمنوں کی طرف سے ”دین میں مداخلت“ کو بھی وقتی طور پر گوارا کر لیا۔ تاکہ دعوت کا کام جاری رہے جو اہل ایمان کے لئے ہر قسم کی کامیابیوں کا واحد ذریعہ ہے۔

جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ مقصد کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ وہ دوسرے تمام نقصانات کو نظر انداز کرتا رہتا ہے تاکہ اصل مقصد ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اور جب کوئی مقصد سامنے نہ رہے تو وہ ہر چیز میں الجھتا ہے۔ وہ ہر بات کے لئے دوسروں سے لڑتا ہے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں یہی کیوں نہ ہو کہ چھوٹے نقصان کو برداشت نہ کرنے کی بنا پر اس کو زیادہ بڑا نقصان برداشت کرنا پڑے۔۔۔۔۔ داعی اس دنیا کا سب سے زیادہ بامقصد انسان ہے، اس لئے وہ ہمیشہ پہلے رویہ کو اختیار کرتا ہے نہ کہ دوسرے رویہ کو۔ اس کلیہ سے مستثنیٰ صرف وہ امور ہیں جب کہ معاملہ خالص دفاعی ہو، اس کا دعوتی مقصد سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس تمہید کے بعد یہاں ہم مختلف پہلوؤں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ واقعات نقل کرتے ہیں جن میں ہماری زندگی کے لئے زبردست سبق اور نصیحت موجود ہے۔

# بچے کی بھلائی عورت کا احترام ملک کی شان

تفصیلی معلومات کے لئے اس کوپن کا استعمال کیجئے :-

ڈی جی ڈائریکٹر،  
اس میلنگ یونٹ،  
ڈائریکٹوریٹ آف ایڈرڈ ٹرائنگ اینڈ وڈرول پبلسٹی،  
”بی“ بلاک، کستور باگاندھی مارگ،  
نئی دہلی 110001  
نئے 20 نکاتی پروگرام کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے  
براہ کرم مجھے انڈیا/ہندی/انگریزی میں کتابچے روانہ کریں۔  
نام \_\_\_\_\_  
پتہ \_\_\_\_\_  
پن کوڈ نمبر \_\_\_\_\_

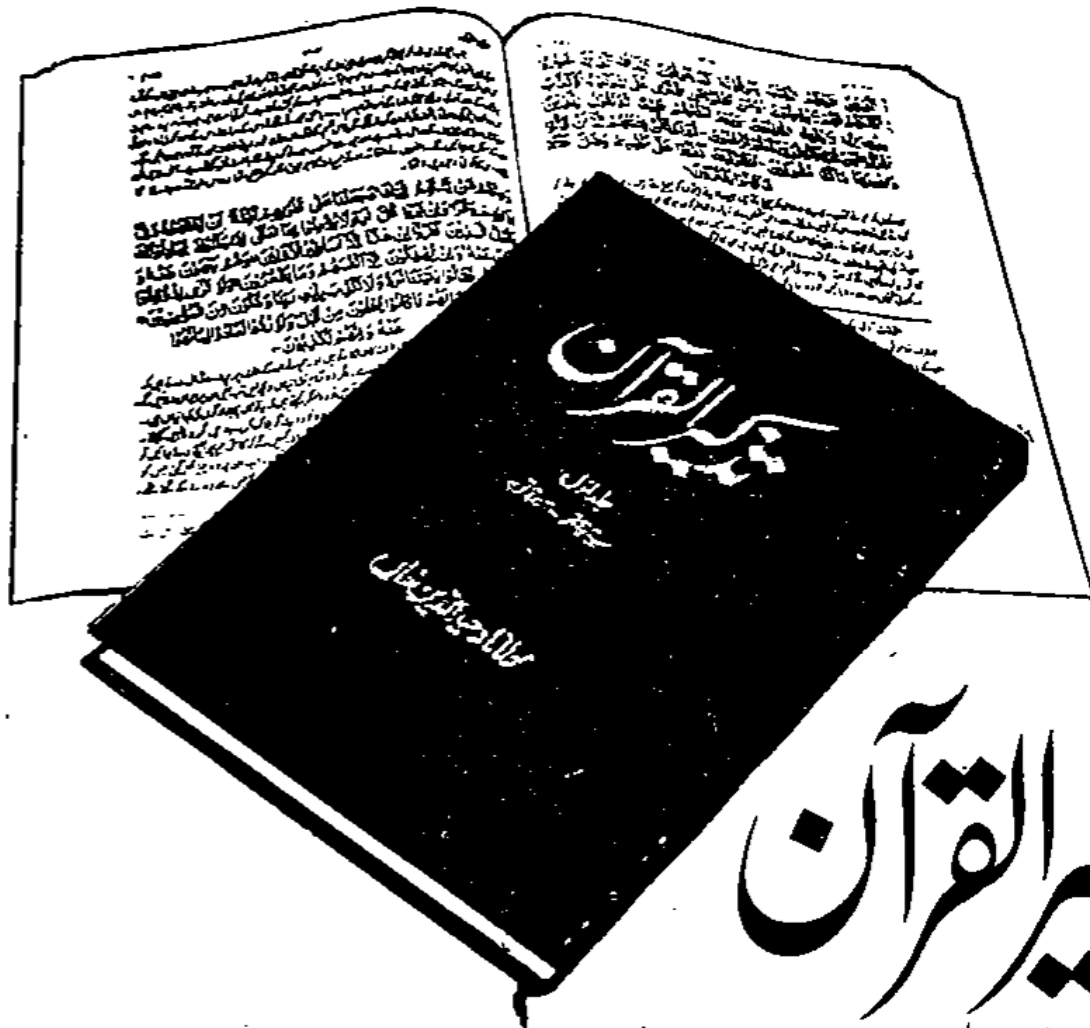
نیا 20 نکاتی پروگرام

ننھا پودا بنتا کلشن  
سلی کی جوانی آج کا بچپن  
بچہ ملک کا پاسدار ہے  
اس پر مستقبل کا بار ہے

نئے 20 نکاتی پروگرام کے تحت بچوں کی صحت، بھلائی اور  
مروڑ نشوونما کا ایک پروگرام چلایا جا رہا ہے۔  
ماں، بچے کو محض جنم ہی نہیں دیتی بلکہ اس کی ابتدائی تعلیم  
و تربیت کی ذمہ دار بھی ہے۔ اس طرح وہ صحیح معنوں  
میں ملک کی معمار ہے۔

عورت اور بچوں کی فلاح پر ہی ملک کی سہوادی اور تحفظ کا  
انحصار ہے۔ اس لئے بچوں کی بھلائی اور عورت کی توقیر و  
احترام کے لئے اس پروگرام میں ایک نئی روح  
بھونکی جا رہی ہے۔

بچے کو پُر غذا خوراک تبھی میسر ہوگی  
جب کُنبہ مختصر ہو



# تذکرہ القرآن

جلد اول سورۃ فاتحہ - سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکرہ القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکرہ القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکرہ القرآن عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کھنچی ہے۔

ہدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

جمعیتہ بلڈنگ - قاسم جان اسٹریٹ - دہلی ۱۱۰۰۶

ثانی انجین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے جے کے آفٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سولائی کیا

# AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)

Telephone : 232231, 526851

## عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین نھان کے قلم سے

- ۱۔ تذکیر القرآن ۵۰۔۔
- ۲۔ الاسلام ۱۵۔۰
- ۳۔ مذہب اور جدید چیلنج ۱۵۔۰
- ۴۔ ظہور اسلام ۱۵۔۰
- ۵۔ دین کیا ہے؟ ۲۰۔۰
- ۶۔ قرآن کا مطلوب انسان ۵۰۔۰
- ۷۔ تجدید دین ۳۰۔۰
- ۸۔ اسلام دین فطرت ۳۰۔۰
- ۹۔ تعمیر ملت ۳۰۔۰
- ۱۰۔ تاریخ کا سبق ۲۰۔۰
- ۱۱۔ مذہب اور سائنس ۵۰۔۰
- ۱۲۔ عقلیات اسلام ۳۰۔۰
- ۱۳۔ فسادات کا مسئلہ ۲۰۔۰
- ۱۴۔ انسان اپنے آپ کو پہچان ۱۰۔۰
- ۱۵۔ تعارف اسلام ۲۰۵۔۰
- ۱۶۔ اسلام پندرھویں صدی میں ۲۰۔۰
- ۱۷۔ راہیں بند نہیں ۳۰۔۰
- ۱۸۔ دینی تعلیم ۳۰۔۰
- ۱۹۔ ایمانی طاقت ۳۰۔۰
- ۲۰۔ اتحاد و ملت ۳۰۔۰
- ۲۱۔ سبق آموز واقعات ۳۰۔۰
- ۲۲۔ اسلامی دعوت ۳۰۔۰
- ۲۳۔ زلزلہ قیامت ۲۰۰۔۰
- ۲۴۔ سچا راستہ ۱۰۰۔۰
- ۲۵۔ نارِ جہنم ۳۰۔۰
- ۲۶۔ باغِ جنت ۳۰۰۔۰



مکتبہ الرسالہ - دہلی - ۶